مقام جمال الدین افغانی رح

بطلِ حریت جمال الدین افغانی کی بارگاہ میں
مشاہیر ادبائے اردو کا نذرانۂ عقیدت

مولانا ابوالکلام آزاد	علامہ اقبال رح	نواب ذوالقدر جنگ
علامہ عبداللہ عمادی	سید رشید رضا	مولانا عبدالقدوس ہاشمی
قاضی عبدالغفار	قائد ملت بہادر یار جنگ بہادر	ابوالحسنات ندوی
ضیاء الدین برنی	مولانا ظفر علی خاں	مبارز الدین رفعت

قیمت تین روپئے کلدار
تین روپئے آٹھ آنے حالی
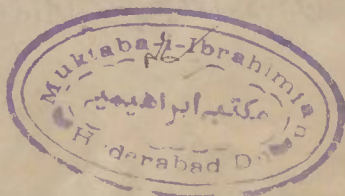
طبعِ اوّل.................ایک ہزار

پروپرائٹر:- چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری

مہتمم:- چودھری منظور الحق

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد- دکن

فہرستِ مضامین

۱۔مقام جمال الدین افغانی ـــــــ چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری۔ ۷

۲۔سرآغاز ـــــــ سید مبارز الدین رفعت ۔۔ ۔ ۱۱

سوانح حیات

۳۔سید جمال الدین ـــــــ ضیاء الدین برنی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳

۴۔سید جمال الدین الافغان رحمۃ اللہ علیہ ـــ مولینا ظفر علی خاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۸

۵۔مصلح شرق بطل حریت سید جمال الدین افغانی ابو العلا محمد اسمٰعیل گودھری۔۔۔۔۔ ۶۵

شخصیت

۶۔سید جمال الدین اسد آبادی ـــــ مولینا ابو الکلام آزاد۔۔۔۔۔۔۔ ۹۲

۷۔سید جمال الدین الافغانی ـــــ نواب ذو القدر جنگ بہادر۔۔۔۔۔ ۹۹

۸۔مجاہد اعظم ـــــــ علامہ عبد اللہ عمادی۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱۸

۹ شاہین سید ـــــــ سید مبارز الدین رفعتؔ ۔۔۔۔۔۔ ۱۲۳

۱۰۔افغانی اپنوں اور غیروں کی نظر میں ـــ سید مبارز الدین رفعتؔ ۔۔۔۔۔۔ ۱۲۹

کام

۱۱- پان اسلامزم یا اتحادِ اسلامیت — ابرار حسین فاروقی ام۔اے ۱۳۸
۱۲- عالمِ اسلام اور جمال الدین افغانی — جامعہ ملیہ کے ایک استاد کے قلم سے ۱۵۰
۱۳- ایران کی اقتصادی غلامی اور جمال الدین افغانی سید رشید رضا.......... ۱۶۱
۱۴- العروۃ الوثقیٰ ——— ابو الحسنات ندوی......... ۱۶۴
۱۵- اتحاد اسلامی اور جمال الدین — عبد القدوس ہاشمی ۱۸۶
۱۶- جمال الدین افغانی کی فارسی تحریریں۔ قاضی عبد الغفار........... ۱۹۴

پیام

۱۷- افغانی کا پیام ——— قائدِ ملت بہادر یار جنگ رح....... ۲۰۶
۱۸- زیارتِ روح جمال الدین افغانی علامہ اقبال رح.......... ۲۱۳

تصانیف و مکاتیب

۱۹- مکاتیب جمال الدین.................................. ۲۴۸
۲۰- تصانیف جمال الدین.................................. ۲۵۸
۲۱- کتابیات.................................. ۲۶۲

سرزمین دکن کے جمال الدین افغانی

قائدِ ملت رح کی یاد میں

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود!

از چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری

مقامِ جمال الدین

سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ اس چشم و بصیرت کے مالک تھے جو طوفان کے آنے سے پہلے ہی اس کے آثار سے طوفان کی وسعتوں اور تباہ کاریوں کو دیکھ لیتی ہیں۔ اور اس دل و دماغ کے حامل تھے جس پر مزاجِ گردشِ ایام پوری طرح واضح رہتا ہے۔ خُدا کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں چودھویں صدی ہجری کے اس مجدّد اعظم پر کہ اس نے اپنی شعلہ نوائیوں سے نیند کے ماتوں کو جگایا۔ اور اٹھا کر کام سے لگایا۔ اور اللہ تعالیٰ کی لاکھوں مہربانیاں ہوں اللہ کے اس بندے پر جس نے عرب و عجم، ہندوستان و مصر، فرنگستان و افغانستان ہر جگہ ہزاروں طرح کی مصیبتیں جھیل کر بھی سرورِ کائنات فخرِ موجودات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کا پیغام سُنایا۔ جس نے اپنوں کے ہاتھوں بھی

دُکھ اٹھایا۔ اور غیروں کے ہاتھوں بھی۔ اور جسے شیطانی و طاغوتی طاقتوں نے کہیں بھی چین سے سانس نہ لینے دیا۔ لیکن ان سب کے باوجود اس نے وطنیت و قومیت کے خونی دیوتاؤں کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اس نے نسلیت کی خونخوار دیوی کے آگے سر جھکانے سے احتراز کیا۔ اور آخر وقت تک ان دیوتاؤں اور دیویوں کے خلاف جہاد کرتا ہوا، رفیقِ اعلیٰ سے جا ملا۔ کہا جاتا ہے کہ ملوکیت وطنیت اور نسلیت کے اتحادِ ثلاثہ نے اسے شہید کر ڈالا۔ مقربین کا یہی مقام ہے اسے شہید ہی ہونا چاہیئے تھا۔

میری تمنّا ہے کہ اس مجاہد اعظم کے حالات افکار اور اس کے پیام پر گرانقدر کتابیں شائع کروں۔ اور اتنی شائع کروں کہ ابنائے زمانہ کی آنکھوں میں افغانی کا مقام آجائے۔ اور لوگ اس کی تعلیمات سے پوری طرح کسب کر سکیں۔ میں نے اس سلسلے میں کوشش اسی وقت سے شروع کر دی تھی۔ جبکہ مولانا محمدؐ علی جوہر مرحوم اور علاّمہ اقبال مرحوم کے احوال و افکار پر مطبوعات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی اردو زبان میں اعلیٰ درجے کے اربابِ قلم

بہت ہی تھوڑے پیدا ہو سکے ہیں۔ اور جو تھوڑے ہیں وہ اپنے ملّی و اجتماعی کاموں یا اپنے منصبی فرائض میں اس طرح منہمک و عدیم الفرصت ہیں کہ ضخیم کتابوں اور تفصیلی تصانیف کے لیے ان کے پاس وقت نہیں اس لئے میں نے طے کیا کہ اردو زبان کے بہترین اربابِ فضل کے رشحاتِ قلم کو مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کر دوں یقیناً اس سے بہتر ہوتا کہ ایک ہی قلم سے نکلی ہوئی مفصل و مربوط کتاب شائع کی جاتی۔ لیکن جب تک ایسی کتاب تیار ہو، ان مجموعوں کی اشاعت ناگزیر ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ایک ضخیم اور مفصل کتاب سید جمال الدین افغانی رح کے متعلق شائع کریں۔ اور خدا سے امید ہے کہ جلد ہی ایسی کتاب پیش کر سکیں گے۔ اس کے لئے میں نے علّامہ عبد القدوس ہاشمی کو روح جمال الدین کے نام سے ضخیم اور مبسوط کتاب لکھنے کی زحمت دی ہے۔ غالبًا اہل علم کو معلوم ہے کہ علّامہ ہاشمی نے عربی مصنفین کے سب سے بڑے عربی تذکرہ "معجم المصنفین" کی تالیف پر گیارہ سال صرف کئے ہیں۔ اور حضرت افغانی کے کارناموں اور تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ کتاب "رُوحِ جمال الدین" کی

تصنیف شروع ہو چکی ہے اور مصنف نے پچھلے سال کا بڑا حصّہ اس پہ صرف کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ایک اہم کتاب ہو گی۔

زیرِ نظر کتاب مولوی مبارز الدین صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے تلاش سے سید افغانی کی زندگی، ان کی تحریک اور ان کی تعلیمات پہ بہترین مضامین یکجا کئے ہیں! ان مضامین کے لکھنے والے مسلمہ طور پہ بہترین اربابِ قلم ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جنھوں نے جمال الدین افغانی کے افکار و خیالات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے مطالعہ کا نچوڑ اپنے مضامین میں پیش فرمایا ہے۔

از سید مبارز الدین رفعت
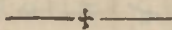
سر آغاز

علّامہ سید جمال الدین افغانی کی شخصیت کیا تھی، اور انھوں نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے، اس کا حال تو آپ آنے والے صفحات میں پڑھنے والے ہیں۔ لیکن یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ افغانی کی شخصیت پر اردو میں ان کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ قاضی عبدالغفار صاحب کی "آثارِ جمال الدین" اور جامعہ ملیہ کی شائع کردہ کتاب "جمال الدین افغانی" کے سوا اردو میں اس عظیم المرتبت ہستی کے متعلق جو کچھ ملتا ہے۔ اس کا بہترین انتخاب یہی سب کچھ ہے۔ جو "مقامِ جمال الدین افغانی" میں پیش کیا گیا ہے۔

بہر حال یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہماری قوم نے، گو دیر سے سہی۔ جمال الدین کے صحیح مرتبے اور اصل مقام کو پہچاننے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ ان کے سوانح حیات جاننے، ان کے پیام کو دل میں اتارنے اور ان کے کام کی اتباع کرنے کی اب عام خواہش پیدا ہو چلی ہے۔ اب وہ دن دور نہیں معلوم ہوتے جب کہ اردو میں بھی صبح مشرق کے اولین ستارے کے متعلق مستند سے مستند تصانیف پیش کی جانے لگیں گی۔

مقام جمال الدین افغانی میں کوشش کی گئی ہے کہ علامہ افغانی کے سوانح،

سیرت، کردار اور ان کی شخصیت کو ہر زاویۂ نظر سے پیش کیا جائے۔ ان کی زندگی کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی جائے۔ ان کے پیام اور ان کے کام کا ہر پہلو سے جائزہ لیا جائے۔ اور اس کو اردو کے ممتاز اور صاحبِ نظر ادیبوں کی ترجمانی کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

رُوحِ جمال الدین کے مطالعہ میں اگر یہ حقیقت پیش نظر رکھی جائے تو اچھا ہے کہ افغانی کا سارا کارنامہ ان کی شخصیت کے گرد گھومتا ہے۔ ان کی زبردست شخصیت، ان کا بلند کردار، اور ان کی بے چین فطرت، ان ہی سے ان کا کارنامہ مرکب ہے۔ اس لئے ان کے کام کی اہمیت جاننے، اس کی توضیح و تشریح کرنے اور اس طرح ان کا مقام متعین کرنے کے لئے ان کے سوانح حیات کا کسی نہ کسی صورت میں جزءً یا کلاً بیان کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ پروفیسر براؤن، جرجی زیدان، اور شیخ محمد عبدہٗ سے لے کر شیخ کے معمولی سے معمولی سوانح نگار تک سبھی نے ان کے سوانح حیات بیان کئے ہیں۔ ہم نے تکرار سے بچنے کے لئے سوانح حیات کے حصہ میں ایسے مضامین جمع کر دیئے ہیں جو شیخ کے اہم ترین سوانح نگاروں کا بہترین خلاصہ ہیں۔ پھر "افغانی اپنوں اور غیروں کی نظر میں" کے عنوان کے تحت ان مشاہیر مصنفوں کی وہ ذاتی رائے اور شخصی نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا۔ جو سید کے بارے میں وہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین میں سے بعض میں ان کے سوانح حیات کی تکرار ناگزیر سی ہو گئی ہے۔ تاہم حکایت دوست کی یہ تکرار اور تذکرہ بھی ایک عجیب حلاوت اور گھلاوٹ اپنے اندر رکھتا ہے ؎

یک قصہ بیش نیست غمِ عشق وایں عجب
از ہر کسے کہ می شنوم نامکرر است!

از ضیاء الدین برنی

سید جمال الدین

سید جمال الدین افغانی کا نام گذشتہ چالیس پچاس سال سے تمام دنیائے اسلام میں جس طرح بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ اس کا اثر تو یہ ہونا چاہئیے تھا کہ لوگوں کو ان کے حالات اور سوانح زندگی بکثرت معلوم ہوتے اور ہر مشرقی زبان میں ان کی متعدد سوانح عمریاں لکھی جاتیں لیکن کس قدر حسرت کا مقام ہے کہ نہ صرف یہ کہ ترکی، عربی، فارسی، اردو کسی زبان میں ان کے حالات کا معتدبہ ذخیرہ نہیں ملتا، بلکہ ان کی زندگی کے اہم اور ضروری اجزا بھی معلوم نہیں۔ روس، انگلستان اور فرانس میں ان کے یورپین دوستوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی حد سے زیادہ ادھورا اور نا تمام ہے۔ اردو میں آج کل چند صاحبوں نے ان کی سوانح نگاری کا فرض ادا کرنا چاہا ہے۔ مگر لفاظی اور مصنوعی انشا پردازی کے سوا اس کے اندر اور کچھ نہیں۔

جرمنی کے فارسی رسالہ کاوہ کے کسی ایرانی

اہل قلم نے سید موصوف پر ایک وسیع اور پر از معلومات مضمون لکھا ہے جس میں تمام متفرق و منتشر معلومات کو اس نے یکجا کر دیا ہے۔ ہمارے دوست ضیائے برنی صاحب اس کو اردو میں منتقل کر کے ہمارے بیحد شکریہ کے مستحق ہوئے ہیں۔ اس کی اہمیت کی بنا پر ہم اس کو مقالات میں جگہ دیتے ہیں، مضمون نگار نے اپنے مضمون کے حوالوں کے متعلق حسب ذیل بیان دیا ہے:۔

سید جمال الدین کے حالاتِ زندگی کا ماخذ شیخ محمد عبدہٗ کی تاریخ ہے جو انھوں نے "الرد علی الدہرئین" کے مقدمہ میں دی ہے اور جس میں شرح وبسط کے ساتھ واقعات لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر براؤن نے بھی "تاریخ انقلابِ ایران" میں ان کی مفصل سوانح عمری درج کی ہے۔ لندن کے زمانۂ قیام کا حال خود بلنٹ نے اپنی کتاب (گارڈن اٹ قرطوم) میں تفصیل وار لکھا ہے۔ اور روز مرہ کے حالات درج کئے ہیں۔ مزید برآں گولڈزیہر نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جمال الدین کے تحت میں کچھ حالات بیان کئے ہیں۔ "تاریخ بیداریٔ ایرانیاں" مصنفہ ناظم الاسلام کرمانی "مشاہیر الشرق" مصنفہ جرجی زیدان اور "المآثر والآثار" مصنفہ اعتماد السلطنت سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ ان دوستوں کی روایات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے جو طہران، روس، لندن اسلامبول وغیرہ

ہیں مشارٌالیہ سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے یا ان کے
ساتھ رہ چکے تھے۔

سید سلیمان ندوی

مشرقی ممالک میں سید جمال الدین عام طور پر افغانی کے نام سے مشہور ہیں اقوام اسلام کے سیاسی معاملات سے انھیں بہت زیادہ شغف تھا۔ صاحب موصوف بلاشبہ ایک غیر معمولی انسان اور اعلیٰ خصائل سے متصف بزرگ تھے خداوند تعالیٰ نے مختلف صفات ان کی ذات میں جمع کر دی تھیں۔ ان کی مخصوص فطری قابلیت یہ تھی کہ ان کے ارشادات سامعین کے دل میں اتر جاتے تھے۔

ان کی زندگی کے ابتدائی واقعات معلوم نہیں۔ ان کے مولد کے متعلق دو مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ افغانی تھے اور ہندوستان جا رہے تھے۔ مگر تحصیل علوم افغانستان میں کی تھی دوسری میں ان کا اسدآبادی ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ اور تحصیلِ علوم ہمدان، قزوین، اصفہان اور مشہد سے منسوب کی جاتی ہے جن اشخاص نے ان کی زندگی کے حالات تحریر کیے ہیں وہ ان دونوں روایتوں کی وجہ سے الجھن میں پڑ گئے ہیں۔ بہر حال بہت سے غیر ایرانی جو سید صاحب سے ملے ہیں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ سید صاحب اپنے تئیں افغانی بتاتے تھے۔ ہمیں مختلف احتمالات میں سے یہ احتمال حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصلاً ایرانی تھے۔ اور اسدآباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام سید صفدر تھا جو اسی ولایت کے رہنے والے تھے۔ بظاہر وہ عالمِ نوجوانی میں ہجرت کر کے کابل چلے گئے تھے اور وہیں اپنی غیر معمولی قابلیت کے جوہر دکھائے اور اعلیٰ درجات پر فائز ہوئے۔

سال پیدائش ۱۲۵۴ھ ہے۔ عالم طفولیت ہی میں اسلامی علوم میں تبحر حاصل کر لیا تھا[1]۔ اور حکمت، ریاضی اور نجوم میں بھی کافی دستگاہ پیدا کر لی تھی۔ تاریخ پر انھیں بہت زیادہ عبور تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہندوستان کا سفر کیا، اور ایک سال اور چند مہینے تک وہاں قیام کیا۔ یہیں رہ کر انھوں نے یورپین علوم سے کسی حد تک واقفیت پیدا کی اور سیاسیات سے دلچسپی لینی شروع کی۔ اس کے بعد ۱۲۷۳ھ میں مکہ معظمہ کا سفر کیا۔ اس میں پورا ایک سال لگا۔ حجاز سے واپس افغانستان آئے اور آتے ہی امیر دوست محمد خان کی ملازمت کر لی۔ جو لڑائی امیر مذکور اور اس کے عمزادہ اور داماد سلطان احمد شاہ کے مابین ہرات میں ہو رہی تھی۔ اس میں سید جمال الدین امیر کی معیت میں تھے۔ دوست محمد خاں نے ۱۲۷۹ھ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد شیر علی خاں تخت نشین ہوا اور اس نے اپنے وزیر محمد رفیق خاں کی تحریک سے اپنے بھائیوں محمد افضل خاں، محمد اسلم خاں اور محمد امین خاں کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔ آخری تین اشخاص کو اس کا پہلے سے علم ہو گیا، اور وہ فرار ہو گئے اور خانہ جنگی شروع کر دی۔ بالآخر محمد اعظم خاں اور افضل خاں کے صاحبزادے عبدالرحمٰن خاں (جو بعد میں امیر ہوئے) نے مل کر کابل فتح کیا، اور محمد افضل خاں کو قید خانہ سے رہائی دے کر غزنین میں لائے اور اس کو امیر افغانستان بنایا[2]۔ اس کا انتقال تقریباً ایک سال بعد ہو گیا[3]۔ اور اس کے بعد مرحوم کے بھائی

---

[1] مصنف المآثر والآثار کے بیان کے مطابق علوم شرعیہ کی تحصیل قزوین میں کی اور پھر وہاں سے طہران میں آ گئے۔

[2] محرم ۱۲۸۳ھ۔ [3] جمادی الآخر ۱۲۸۴ھ۔

محمد اعظم خاں جانشین ہوئے۔ جدید امیر نے سید جمال الدین کو اپنا مشیر خاص بنا لیا۔ اور ہمیشہ انھی کی رائے سے کام کیا کرتا تھا۔ شیر علی خاں امیر سابق ابھی تک قندھار میں تھا۔ اور افغانستان کا ایک بڑا حصہ اس کے قبضۂ و تصرف میں تھا۔ ۱۲۸۵ھ میں شیر علی خاں نے کابل پر حملہ کر دیا اور مدت تک جنگ جاری رکھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے اسی سال، جمادی الآخر میں کابل کو فتح کر لیا۔ اور دوبارہ تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس واقعہ کے بعد محمد اعظم خاں، نیشا پور اور اس کا بھتیجا عبدالرحمن خاں، بخارا بھاگ کر چلا گیا۔ سید جمال الدین بدستور کابل ہی میں رہے، اور اپنی سیادت کے باعث شیر علی خاں کے انتقام سے محفوظ رہے۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد حج کے ارادے سے سفر مکہ کی اجازت چاہی، اور افغانستان سے روانہ ہو گئے۔ سفر حجاز کی اجازت نامہ میں یہ شرط درج تھی کہ ایران سے ہوتے ہوئے نہ جائیں (مبادا محمد اعظم خان سے ملاقات کریں) اسی وجہ سے وہ ۱۲۸۵ھ میں ہندوستان کی راہ سے عازم حجاز ہوئے۔ ہندوستان میں ایک ماہ تک انھیں ٹھیرنا پڑا۔ اور بالآخر وہ مصر کے جہاز سے روانہ ہو گئے۔ مصر میں چالیس دن تک قیام رہا اور اس عرصہ میں علماء جامع ازہر کے ساتھ مذاکرات علمی ہوتے رہے۔ سفر مکہ۔ کے بعد وہ اسلامبول پہنچے۔ جہاں دولتِ عثمانی اور بالخصوص صدر اعظم علی پاشا کی جانب سے ان کا تپاک آمیز استقبال کیا گیا۔ چھ ماہ کے قیام کے بعد وہ "انجمن دانش عثمانی" کے ممبر بن گئے۔ قسطنطنیہ میں پہنچنے کے ساتھ حسن فہمی (شیخ الاسلام) کے دل میں ان کی طرف سے جذبۂ حسد پیدا ہو گیا سید اگرچہ جوان تھے، مگر عالم جیّد اور شیخ الاسلام حسبِ معمول معمر اور جاہل۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایران یا افغانستان کا ایک نوجوان اسلامبول آئے

اور اعیانِ مملکت کی جانب سے اس کی اس قدر عزت و احترام ہو۔ سید صاحب نے راقم الحروف کے ایک دوست سے پیٹرزبرگ میں یہ بات بیان کی تھی کہ اسلامبول پہنچنے کے بعد میں شیخ الاسلام کی مجلس میں گیا اور نہایت بے اعتنائی کے ساتھ صدر مجلس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ جس کی وجہ سے شیخ الاسلام مجھ سے ناراض ہو گئے........" شیخ الاسلام موقع کی تلاش میں تھے تاکہ اپنے مخصوص حربے سے کام لیں، جسے وہ ہزار سال سے حقیقی علماء اور دانشوروں کے خلاف استعمال کرتے رہے ہیں یعنی اپنے حریف کے خلاف کفر کا فتویٰ دے کر اسے میدان سے نکال دیں۔ چنانچہ انھیں یہ موقع رمضان (۱۲۸۷ھ) میں ملا (اس لئے کہ اسی مہینے اس حربہ کو صیقل کیا جاتا ہے۔) تحسین پاشا (وزیر دار الفنون) صفوت پاشا (وزیر علوم) اور ملیف پاشا (سفیر قدیم متعینہ طہران) اور دیگر اصحاب کی درخواست پر سید جمال الدین نے دار الفنون کے محصلین کے روبرو اپنا ایڈریس (خطبہ) پڑھا[1]۔ شیخ الاسلام نے اس کے ایک جملہ کی غلط تفسیر[2] کر کے شور و غل بپا کر دیا۔ عرصہ تک اس فقرہ پر اخبارات میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں، اور جب بہت زیادہ شدت اور تلخی کا اظہار ہونے لگا، تو اس وقت (اواخر ۱۲۸۷ھ) ارادۂ سلطانی صادر ہوا کہ سید کچھ عرصہ کے لئے اسلامبول سے باہر چلے جائیں۔ چنانچہ وہ مصر روانہ ہو گئے اور عین ایرانی نوروز کو وہاں پہنچے۔

---

[1] بعض حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا موقع آخر شعبان میں پیش آیا ہے اس لئے کہ عثمانی ممالک میں ایامِ رمضان میں دار الفنون عموماً بند رہتے ہیں۔

[2] ایڈریس اور شیخ الاسلام کے اسرار کی پوری تفصیل "الرد علی الدہریین" کے مقدمہ میں درج ہے

درحقیقت سید جمال الدین کا سیاسی اور علمی شہرہ اسی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں ان کا ارادہ مصر میں اقامت کرنے کا نہ تھا لیکن ریاض پاشا نے جو وزارت مصری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے، ان سے ملاقات کی، اور ان کی لیاقت اور کمالات سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان کے لئے حکومتِ مصر سے ایک ہزار غروش مصری کا ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر سید مصر میں رہنے لگے۔ دور دور سے طالب علم استفادہ کے لئے آتے تھے۔ شروع میں اپنے ہی مکان میں اور بعد میں جامع ازہر میں مختلف علوم اسلامی پر درس دیتے تھے۔ ان کی شہرت کا دائرہ روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔ اور اپنی غیر معمولی فصاحت و بلاغت اور قدرت بیان کے باعث انھوں نے اپنے شاگردوں کو سکھایا کہ مختلف مضامین کو عربی میں کس طرح نیچرل (فطری) طرز میں ادا کیا جا سکتا ہے مصریوں میں بھی پرانے خیال کے فقہا ان کے مخالف ہو گئے اور درس فلسفہ کے باعث ان پر سخت اعتراضات وارد کئے گئے[1]۔ یورپ جو مصر میں سلطنتِ انگریزی نمائندہ تھا، ان کے سیاسی خیالات سے اس قدر برافروختہ ہوا کہ بالآخر توفیق پاشا کو جو نئے نئے خدیو مقرر ہوئے تھے۔ ان کے اخراج کا حکم نافذ کرنے پر مائل کر دیا۔ چنانچہ وہ ماہِ شوال ۱۲۹۶ھ میں اپنے خادم اور شاگرد ابوتراب کے ساتھ مصر سے خارج کر دیئے گئے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں "سنی" کے تحت میں درج ہے کہ سید جمال الدین نے ابن سینا کے فلسفہ کو جامع ازہر کے نصاب میں داخل کر دیا تھا۔ وہ اس پر درس دیا کرتے تھے، اور زمین کی شکل دکھانے کی غرض سے مسجد میں ایک کرّہ بھی لے آئے تھے جس پر علما نے بے حد غوغا بلند کیا تھا اور بالآخر وہ ازہر سے خارج کر دیئے گئے۔

اس معاملہ کے متعلق اشخاص سے مختلف روایات سننے میں آئی ہیں خود سید نے کسی سے کہا تھا کہ میں نے اسمعیل پاشا کے خلاف مصری افواج کی مشہور و معروف بغاوت کی مخالفت کی تھی۔ اور مصر میں بھی یہ سنا گیا کہ وہ فرامیسن لاج میں داخل ہو گئے تھے اور وہاں انگریزی فضا کی مخالفت میں چند کلمات کہے تھے۔ بعض عربی جرائد سے یہ معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے فرامین لاج کی بنیاد قائم کی تھی جس کے ممبروں کی تعداد تین سو تھی۔ اکثر مصری نوجوان نے جو اس زمانے میں تحریک حریت میں پیش پیش تھے۔ اور نیز بعض اہل قلم نے اس سے استفاضہ کیا تھا۔ شیخ محمد عبدہٗ (مفتی) ان کے شاگرد تھے۔ اور اسی طرح اسحاق (ادیب) بھی ان کے تلامذہ میں سے تھے مشہور یہ ہے کہ عربی پاشا جو مصری شورش پسندوں کے سرخیل تھے، ان سے بہرہ مند ہو چکے تھے۔ ایک خط[1] میں جو خود سید صاحب نے فرانسیسی زبان میں مسٹر بلنٹ کو لکھا تھا یہ دعویٰ کیا ہے کہ مہدی سوڈانی کے بہت سے ساتھی میرے شاگرد رہ چکے ہیں۔

جمال الدین مصر سے ہندوستان گئے اور حیدرآباد دکن میں سکونت اختیار کی اور وہیں "ردِ نیچریہ"[2] رسالہ ۱۲۹۷ھ میں فارسی میں تصنیف کیا۔

---

[1] یہ خط جس پر ۲۴ جمادی الآخر ۱۳۰۱ھ کی تاریخ ثبت ہے، پیرس سے لندن گیا تھا اور بلنٹ کی کتاب "گارڈن اٹ خرطوم" میں موجود ہے۔

[2] یعنی ردِ دہریاں، یہ رسالہ بمبئی میں ۱۸۹۸ء میں چھپا، اور اس کا اردو ترجمہ ۱۳۰۰ھ میں کلکتہ میں طبع ہوا۔ اس کا عربی ترجمہ شیخ محمد عبدہ نے "الرد علی الدہریین" کے نام سے کیا جو ۱۳۰۳ھ میں بیروت میں چھپا۔

۱۲۹۹ھ میں یعنی مصر پر انگریزی فوج کشی کئے جانے سے پیشتر جو اسی سال ماہِ شعبان میں عمل میں آئی تھی، حکومتِ ہند نے انھیں دکن سے کلکتہ میں بلا لیا، اور وہاں انھیں مصری شورش کے فرو ہو جانے تک نظر بند رکھا۔ واقعۂ مصر کے بعد انھیں حکم دیا گیا کہ ہندوستان سے باہر چلے جائیں۔ ہندوستان سے وہ بظاہر امریکہ گئے، یا چند دن لندن میں ٹھیر کر عازم امریکہ ہو گئے۔

امریکہ میں چند ماہ رہے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ جمہوریت کا مطالعہ کریں۔ بعد ازاں وہ لندن روانہ ہوئے۔ اور جمادی الآخر یا رجب ۱۳۰۰ھ میں انگلستان پہنچے۔ کچھ دنوں بعد وہ ذی قعدہ میں پیرس گئے۔ اسی زمانہ میں ولفرڈ بلنٹ (مشہور سیاست دان و مصنف) انھیں پیرس میں اپنے مکان میں لے گئے۔ بلنٹ رقمطراز ہیں کہ ابتدا میں لندن میں وہ مشائخ کا لباس پہنتے تھے۔ مگر اب انھوں نے علماءِ اسلامبول کا لباس اختیار کر لیا ہے، اور ان کو خوب زیب دیتا ہے۔ انھوں نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی بھی سیکھ لی ہے اور ان مصری سیاسی مفرورین سے جو یہاں پناہ گزیں ہیں، تبادلۂ خیالات کرتے اور نشست و برخاست رکھتے ہیں چونکہ میں خود سیاحتِ ہند کا ارادہ رکھتا تھا اس لئے میری خواہش پر جمال الدین نے چند سفارشی خطوط مجھے دیئے۔ تاکہ لوگ مجھ پر اعتماد کریں۔ ان خطوط کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ تمام ہندوستان میں لوگ ان کی عزت و تکریم کرتے ہیں جس زمانے میں مسٹر بلنٹ کے ساتھ پیرس میں

لہ WILFRIE BLUNT یہ صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں انگریزی قبضۂ مصر کی خفیہ تاریخ نمایاں شہرت رکھتی ہے۔

مقیم تھے۔ اس وقت انھوں نے ایک جلسہ میں تقریر بھی کی تھی، اور افغانستان میں اپنے خاندان کے متعلق حالات بیان کئے تھے۔ اور چند حکایات بھی سنائی تھیں۔

جمال الدین تقریباً تین سال تک پیرس میں مقیم رہے رجب ۱۳۰۱ھ کی ابتدا میں ٹیورن کی نمائش دیکھنے کی غرض سے اطالیہ گئے۔ وہاں ایک ہفتہ ٹھیرنے کے بعد پیرس لوٹ آئے۔ بلنٹ سے ان کی ۱۳۰۱ھ کی بہار میں پیرس میں دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ شیخ محمدؐ عبدہ کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں[1] جس کا طول ½۲ گز اور عرض بھی اسی قدر ہوگا، اور جو سب سے آخری منزل پر واقع تھا۔ رہتے تھے اور وہیں سے اپنے اخبار "العروۃ الوثقیٰ" کی ادارت کرتے تھے۔ اس زمانے میں مہدی سوڈانی کا مسئلہ انگلستان کے پیش نظر تھا۔ اور سید مہدی سے راہ ورسم اور خط وکتابت رکھتے تھے، اس لئے یہ تجویز کی گئی کہ سید جمال الدین، مہدی اور انگلستان کے درمیان ثالث بن کر صلح کرادیں۔ اور اس غرض کے حصول کے لئے مہدی کے پاس ایک وفد بھیجا جائے۔ بظاہر گلیڈاسٹون جو انگلستان کے وزیر اعظم تھے۔ اسی غرض سے پیرس میں مقیم تھے۔ لیکن بالآخر انگلستان کی وزارت خارجہ نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ اخبار "العروۃ الوثقیٰ" ۱۳۰۱ھ میں پیرس سے جاری کیا گیا تھا[2]۔ اور اس کا پہلا پرچہ ۲۵ جمادی الاول کو شائع

---

[1] یہ مکان کوچہ سیزر RUE DE SEIZE میں واقع تھا اخبار کے چھٹے نمبر میں محل ادارت تبدیل کر دیا گیا تھا جدید مکان کوچہ مارٹل RUE MARTEL میں واقع تھا۔

[2] سید جمال الدین اور محمدؐ عبدہ کی جانب سے۔

ہوا۔اس اخبار کے اٹھارہ نمبر نکلے۔سترھواں نمبر ۴۔ذی الحجہ کو اور آخری ۲۶۔ذی کو شائع ہوا۔انگریزی حکومت اس ہفتہ وار اخبار کی روزافزوں ہر دلعزیزی سے بہت تشویش میں پڑ گئی۔اور مختلف ذرائع سے جن میں اس کا داخلۂ ہند بھی ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔اس کے بند کرنے کے اسباب پیدا کر دیئے۔

جس زمانہ میں وہ پیرس میں تھے۔وہ فرانسیسی اخبارات میں مشرقی معاملات پر مضامین لکھا کرتے تھے۔انگریزی اخبار بھی ان کے اقتباسات درج کرتے تھے۔ان تمام مباحث میں وہ مباحثہ خاص طور پر مشہور ہے جو ارنسٹ رینان[۵۱] مشہور فرانسیسی عالم کے ساتھ "اسلام و علم" کے موضوع پر ہوا[۵۲] انگلستان کی وزارت سے گلیڈ اسٹون کے مستعفی ہو جانے پر (۲۵۔شعبان ۱۳۰۲ھ) اور چرچل کے وزیر ہند ہو جانے پر بلنٹ نے جمال الدین کو لندن آنے کی دعوت دی۔تاکہ چرچل کے ساتھ عالم اسلام اور انگلستان کے مابین اتحاد کی گفتگو کی جائے۔چنانچہ سید ۱۔شوال کو وارد لندن ہوئے۔اور

---

[۵۱] EARNEST RENAN ۔

[۵۲] رینان نے ۲۰۔جمادی الاول ۱۳۰۰ھ کو سوربون کے دار الفنون میں "اسلام اور علم" پر لکچر دیا تھا۔جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ اسلام علم و تمدن سے نا آشنا ہے۔سید جمال الدین نے اس کا جواب فرانسیسی رسالہ "جرنل دی دبا" (JAURNAL DE DEBATS) میں شائع کیا۔رینان نے اس کا جواب لکھا۔رینان کا لکچر اور اس کا جواب رینان کے لکچروں کے مجموعے میں شائع ہو چکا ہے۔

بلنٹ کے یہاں فروکش ہوئے۔ جہاں وہ تین مہینے سے زیادہ ٹھیرے۔ انھی کے گھر میں مسٹر چرچل اور سر ڈرمند ولف[1] سے ملاقاتیں رہیں۔ اسی سال ماہ ذیقعدہ میں یہ تجویز طے ہوئی کہ سید جمال الدین ڈرمند ولف کے ساتھ سب سے پہلے اسلامبول چلیں، ولف مذکور کا مصر میں انگریزی نمائندے کے طور پر تقرر ہو چکا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ مصر جانے سے پہلے وہ اسلامبول جائیں۔ اور سلطان المعظم کے روبرو مصر کے متعلق ایسی قرارداد پیش کریں جس سے سلطنت عثمانی کو بھی تسلی ہو جائے اور مصر کا بھی تصفیہ ہو رہے۔ جو ان دونوں سلطنتوں کے مابین باعثِ نزاع بنا ہوا تھا۔ ضمناً یہ گفتگو بھی ہوئی تھی کہ مشار الیہ یہ وعدہ کرے گا کہ انگریزی افواج تخلیۂ مصر کر دیں گی، اور اس طرح سے دولِ اسلامی (ترکی، ایران، اور افغانستان) اور دولتِ انگریزی کے مابین اتحاد اور روس کے مقابلے کے ذرائع مہیا کرے گا۔ اس غرض سے سید کو جن کا اثر وزرائے سلطان پر بہت زیادہ تھا۔ اور جو خود بھی اتحادِ اسلام کے طرفدار تھے۔ مفید مطلب پا کر یہ پختہ ارادہ کر لیا گیا کہ انھیں اپنے ساتھ اسلامبول لے جایا جائے۔ مگر عین آخری موقع پر ولف سید کو نظر انداز کر گیا۔ اور وہ تنہا روانہ ہو گیا۔ باوجود اس کے کہ سید کے لئے پاسپورٹ لے لیا گیا تھا۔ اور خرچ راہ بھی ادا کر دیا گیا تھا۔ اس کارروائی سے سید بہت ناراض ہوئے یہاں تک کہ ۱۳۰۳ھ کی ابتدا میں لندن سے روانہ ہو گئے۔[2]

---

[1] مشار الیہ ۱۳۰۶ھ میں ایران میں انگریزی سفیر ہو کر آئے تھے۔

[2] سید جمال الدین بلنٹ کے گھر مہمان تھے کہ ایک دن (۱۹، محرم ۱۳۰۳ھ) ان کے دو دوست ایک ہندی اور ایک عرب ان سے ملنے کے لئے آئے (بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

انگلستان سے سید جمال الدین مشرق روانہ ہوئے[1]۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ یہ نجد جاکر وہاں ایک متمدن اسلامی سلطنت قائم کریں۔ بہر حال اس سفر میں وہ پہلے خلیج فارس (بوشہر) میں آئے اور جب ان کی آمد کی خبر تار کے ذریعہ سے طہران میں پہنچی تو اعتماد السلطنت (محمد حسن خاں) نے ناصرالدین شاہ کے حکم سے انھیں طہران آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ شیراز و اصفہان[2] ہوتے ہوئے طہران پہنچے، اور حاجی محمد حسن ابن الضرب کے مکان میں اترے۔ یہ واقعہ غالباً ربیع الثانی یا جمادی الاول ۱۳۰۴ھ کا ہے۔ طہران میں ان کی مدت اقامت چار مہینے سے زیادہ نہیں رہی۔ اس لئے کہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

کسی مذہبی یا سیاسی مسئلہ پر ان دونوں دوستوں میں اس قدر مباحثہ ہوا کہ تنازعہ اور ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ مجبوراً صاحب خانہ (بلنٹ) نے ان سے چلے جانے کے لئے کہا۔ سید جمال الدین بھی ان دونوں دوستوں کے ساتھ باہر چلے گئے۔ دو تین دن کے بعد جب وہ واپس آئے تو بلنٹ نے ان سے کہا کہ آپ کے لئے نقل مکان کرلینا ہوگا! اس بات سے سید بہت ملول ہوئے اور دوسرا مکان تلاش کرکے وہاں رہنے کے لئے چلے گئے! اور کچھ دنوں کے بعد وہ لندن سے روانہ ہوگئے۔

[1] یہ معلوم نہ ہوسکا کہ لندن سے روانہ ہونے اور ایران پہنچنے تک جس میں ایک سال سے زیادہ زمانہ صرف ہوا، سید صاحب کہاں رہے۔ یہ احتمال ہے کہ وہ کچھ عرصہ تک روس میں رہے اس مدت میں ان کی ملاقات کاتکوف سے ہوئی جس کے ساتھ مل کر وہ کام کرتے رہے

[2] اصفہان میں ظل السلطانی سے ملاقات کی، اس شخص نے ولی عہد بننے اور تخت سلطنت پر متمکن ہوجانے کے لالچ میں سید کا نہایت احترام کے ساتھ استقبال کیا اور سید کے روس چلے جانے کے بعد یہ بات سننے میں آئی ہے کہ ظل السلطان انھیں (بقیہ برصفحہ آئندہ)

شاہ ان سے ناراض ہو گئے تھے! ور حکم دے دیا تھا کہ ایران سے خارج کئے جائیں[۵۱]۔ جس زمانے میں سید طہران میں تھے۔ شاہ نے گیلان کا سفر کیا۔ لیکن جاڑے کی شدت سے مجبور ہو کر قزوین سے واپس لوٹ آیا۔ طہران میں اس غیر حاضری کے زمانے میں بالخصوص وہ نہایت جرأت کے ساتھ اصطلاحات کے نفاذ اور استبداد کی شکستگی کی ضرورت پر علی الاعلان گفتگو کرتے تھے! ایران سے سید جمال الدین روس گئے اور شہر دلادی قفقاز میں محمّد علی خاں کاشی کے مہمان ہوئے! امین الضرب کے طہران سے آنے کے وقت تک وہیں مقیم رہے۔ وہاں سے دونوں مل کر ماسکو پہنچے، جہاں وہ آقا مرزا نعمت اللہ اصفہانی (جو بعد میں اس شہر میں ایرانی قونصل بن گئے) کے یہاں فروکش ہوئے۔

بعدہٗ امین الضرب پیرس چلے گئے، اور سید سینٹ پیٹرزبرگ روانہ ہو گئے ماسکو میں اخبار "مسکوی" کے ایڈیٹر کاتکوف سے ملاقات ہوئی[۵۲] اور وہاں انھوں نے

(بقیہ صفحہ گزشتہ)
اس امید میں روپیہ بھیجا کرتا تھا کہ وہ سلطنت روس کے وزرا کو اس کی جانب مائل کر دیں۔

[۵۱] سید جمال الدین نے شاہ ناصر الدین سے چند بار ملاقاتیں کیں۔ اور ایک ملاقات کے دوران میں انھوں نے کمال جرأت اور صراحت کے ساتھ معاملات سلطنت کی ابتری اور اصلاحات و ترقی کی ضرورت کے متعلق گفتگو کی۔ بادشاہ دل میں اس صاف گوئی سے سخت ناراض ہوا۔

[۵۲] ایک اور روایت کے مطابق جو راقم الحروف تک صرف ایک ہی واسطہ سے پہنچی ہے، یہ ہے کہ سیّد کاتکوف کے تار دے کر بلانے پر روس گئے تھے۔

انگریزوں کے خلاف روس اور دول اسلامی کے مابین اتحاد کی تجویز پیش کی لیکن افسوس یہ ہوا کہ ان کے ورود کے چند ہی دن بعد (۱۱۔ ذیقعدہ ۱۳۰۴ھ) کاٹکوف کا انتقال ہوگیا، اس واقعہ کے بعد سید پیٹرز برگ چلے گئے اور تقریباً دو سال تک وہاں رہے، وہاں مشہور مدبرین سے ملاقاتیں رہیں جنھوں نے سید صاحب کا بظاہر تپاک آمیز استقبال کیا۔ ذیقعدہ ۱۳۰۶ھ میں ہم انھیں میونخ (MUINCH) میں شاہ ناصرالدین کے ساتھ (جو اس مہینہ کی ۲۱ و ۲۲ تاریخ کو اس شہر میں موجود تھے) ملاقات کرتے ہوئے دیکھتے ہیں وہاں امین السلطنت نے جو دولت روس کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرنے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے (روسی حکومت اس سے اس امر سے ناراض تھی کہ امپیریل بنک (بانک شہنشاہی) و معادن اور دریائے کاروں میں جسے انگریزی کشتیوں کے لئے کھول دیا گیا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا ہے) کی غرض سے ہر قسم کے ذرائع استعمال کر چکا تھا[1]۔ یہ خیال کیا کہ سید جمال الدین کو جن کا اثر و اقتدار اعیانِ روس پر ایک حد تک غالب تھا۔ اپنے اور روس کے مابین اصلاح کرانے کے خیال سے پیٹرز برگ بھیجے۔ سید بھی جو ہر ممکن طریقہ سے انگریزی اثر کو صدمہ پہنچانے کے آرزومند تھے! اس تجویز سے بے حد خوش ہوئے اور روس روانہ ہوگئے۔ جیساکہ خود

---

[1] امین السلطان انگریزوں کی ہوا خواہی کے باعث کچھ عرصہ تک معتوب رہنے کے بعد بالآخر ۱۰۔ رجب ۱۳۰۹ھ کو روسی سفارتخانہ واقع طہران میں سفیر روس بوتنروف کے پاس گیا، اور کامل تین گھنٹہ تک ملاقات کی اثناء صحبت میں اس نے پختہ طور پر یہ وعدہ کیا کہ میں آج سے روس کا وفادار رہوں گا، اور ہمیشہ جاں نثاری کا ثبوت دیتا رہوں گا۔

انھوں نے بیان کیا ہے، انھوں نے وزیر اعظم و وزیر خارجہ دوگیرس DE GIERS وزیر خارجہ کے مشیر زینوویف ZINOVIEFF اور اغناتیف IGNATIEW اور خانوں نوویکوف NOVIKOFF اور جنرل ریختر وا بروچیف سے ملاقات کی اور متعلقہ معاملات پر بحث کی۔ اور بقول خود روسی صدر اعظم اور ان کے مشیروں سے بیس مرتبہ ان پر گفتگو کی اور پیٹرزبرگ میں دو ماہ تک اقامت رکھنے کے بعد یہ خیال خود مہم میں کامیاب ہو کر طہران آئے[1] اور پھر حاجی محمد حسن (امین الضرب) کے مکان میں فروکش ہوئے۔ طہران میں تین ماہ تک رہے اور چونکہ وہ کھلم کھلا استبداد کے خلاف بات چیت کرتے تھے۔ اس لئے شاہ نے حکم دیا کہ وہ طہران سے چلے جائیں اور قم میں سکونت اختیار کریں۔ ناچار انھیں شاہ عبدالعظیم میں محصور رکھا گیا اور حالتِ نظر بندی میں رہتے ہوئے تقریباً سات ماہ گزرے ہونگے کہ جمادی الاخریٰ یا رجب ۱۳۰۸ھ میں شاہ کے حکم سے انھیں شاہ عبدالعزیز میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور انواع و اقسام کی سختیوں کے ساتھ انھیں والی بغداد کے پاس بھیجدیا گیا اور اس سے تاکید کی گئی کہ انھیں فی الفور بصرہ روانہ کر دے اور عراقِ عرب کی سیاحت کرنے یا وہاں کے علماء سے ملنے کی اجازت نہ دے مشار الیہ بصرہ پہنچے اور وہاں حاجی سید علی اکبر شیرازی (یہ ایک ایرانی عالم تھے، اور بظاہر وہ بھی خارج البلد ہو چکے تھے) سے ملاقات کی اور ان کی وساطت سے ایک عربی خط مجتہد اعظم حاجی مرزا حسن شیرازی (جو سامرہ میں مقیم تھے) کی خدمت میں لکھا۔ یہ خط خاص شہرت رکھتا ہے اور سید صاحب نے لندن میں اس خط کی نقل شائع کردی تھی۔

---

[1] پیٹرزبرگ سے سید میونخ گئے اور وہاں قونصل ایران مرزا جعفر خاں تبریزی (جو مرزا سید حسین خاں عدالت کے چچازاد بھائی تھے) کے ساتھ رہے اور پھر عازم ایران ہوئے۔

سید صاحب بصرہ میں کچھ عرصہ تک قیام کرنے کے بعد اپنی صحت درست کرنے کی غرض سے لندن پہنچے، ۱۳۰۹ھ کی ابتدا میں وہ لندن ہی میں تھے، مگر آرام کرنے کے بجائے وہ مسئلہ دخانیات و مختلف ملکی مسائل میں معروف رہے، مزید براں پبلک جلسوں میں ایرانی معاملات کے متعلق متعدد لکچر اور ایڈریس دیئے، اور انگریزی جرائد میں مضامین لکھے۔ میرزا ملکم خاں سے جو سفارت کے عہدے سے معزول ہو چکے تھے۔ غالباً ملاقات رہتی تھی رجب ۱۳۰۹ھ میں ایک عربی و انگریزی اخبار جس کا نام "ضیاء الخافقین" تھا لندن سے جاری کیا، اس کام میں غالباً دوسروں کی امداد بھی شامل تھی۔ اور ہر نمبر میں وہ بالخصوص اسلامی معاملات کے بارے میں ایک مضمون لکھا کرتے تھے، اس اخبار کے پہلے پرچے میں ایرانی خرابیوں سے بحث کی گئی تھی اور دوسرے نمبر میں (غرہ شعبان) میں سید نے ایران کے تمام جید علماء کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں ناصر الدین شاہ کو تخت سے اتار دینے کی تحریک کی گئی تھی اس پرچے کی خوب ہی اشاعت ہوئی، بالآخر حکومت انگریزی نے عجیب و غریب اثرات کو کام میں لاکر اس اخبار کے سررشتہ حیات کو منقطع کر دیا۔ مثلاً انگریزی وزارت خارجہ نے اس پریس سے جس میں عربی ٹائپ تھے اور جہاں یہ اخبار چھپتا تھا (یہ مطبع لندن کے مضافات میں واقع تھا) یہ کہا کہ اگر "ضیاء الخافقین" اخبار وہاں چھپتا رہے گا تو حکومت انگریزی اپنی تمام فرمائشات کو اس مطبع سے واپس لے لیگی اور دوسرے کارخانہ کو دیدیگی اس دھمکی سے اخبار موت کی نیند سو گیا، اسی سال کے آخری حصہ میں یا ۱۳۱۰ھ کے ابتدائی ایام میں سید سلطان المعظم کی دعوت پر اسلامبول گئے۔[۵۱]

---

[۵۱] سید کے ایک دوست کی روایت کے مطابق جس نے اُن سے ۱۸۹۲ء میں (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

چونکہ سلطان بہ نفسِ نفیس اتحاد اسلام کے لئے کوشاں تھے اس لئے انھوں نے
سید کی انتظامی قابلیت اور اسلامی ممالک میں ان کے اثر سے فائدہ اٹھانے کی
امید میں انھیں اپنے محل کے قریب ٹھیرایا، اور نشان طاش میں ایک مکان رہنے
کے لئے دیا اور ۷۵ لیرہ عثمانی[1] (تقریباً ۱۰۰۰ روپیہ) ان کے لئے ماہوار مقرر کر دئیے
اس مہم کی ابتدا میں سلطان عبدالحمید خاں سے ان کے مراسم بہت بڑھ گئے
تھے! ور سلطان بھی ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، اور اس کا ثبوت یہ
ہے کہ جب اسلام بول میں بلنٹ کی ۱۳۱۰ھ کے آخر میں ان سے ملاقات ہوئی
تو وہ سلطانی مہمانخانہ (جسے ترکی میں مسافرخانہ کہتے ہیں)، میں فروکش تھے اور
سلطان کی خدمت میں انھیں بہت تقرب حاصل تھا۔ لیکن بعد میں سلطانی دربا
کے تمام پیر مرشد اور درویش جن کا کام فال گیری، تعبیر خواب اور غیب گوئی
تھا اور جن سے سلطان عبدالحمید خاں ہر وقت گھرے رہتے تھے۔ بالخصوص
ابوالہدیٰ (معروف بہ وساییں) نے سلطان کی نظر میں سید کی قدر کم کر دی۔
یہاں تک کہ ان پر ایک گونہ نگرانی سی رہنے لگی جس کی وجہ سے انھیں بعد
میں بہت سی تکلیفیں پہنچیں۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ)
بمقام لندن ملاقات کی تھی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۱۰ھ کے وسط تک وہ لندن
ہی میں مقیم تھے لیکن ہمیں اچھی طرح یہ بات معلوم ہے کہ سال مذکور کے ماہ شوال
میں اور نیز اس سے کچھ عرصہ قبل وہ اسلامبول میں موجود تھے۔ بلنٹ نے بھی
اسی سال ان سے ملاقات کی تھی۔ اور وہی اس بات کے ناقل ہیں کہ سید عید فطر یا
عید اضحیٰ کے موقع پر سلطان کے حضور میں حاضر ہوئے۔

[1] مرزا رضا کرمانی کے قول کے مطابق انھیں ماہانہ ۲۰۰ لیرہ (۲۷۰۰ روپیہ دیا جاتا تھا)

اسلامبول میں چار سال سے زیادہ عرصہ تک اقامت رکھنے کے بعد سید کی حالت بہت کچھ کمزور ہو گئی اس لئے کہ ناصر الدین شاہ کے قتل (۱۳۱۳ھ) کے بعد (جو سید کے ایک مشہور و معروف مرید مرزا رضا کرمانی کے ہاتھوں ہوا تھا) دولت ایران نے سلطنت عثمانی سے سید کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔ مگر سلطان نے ایران کے پیہم اصرار کے باوجود اس مطالبہ کو مسترد کر دیا، اور سید کو حوالہ کرنے سے قطعی انکار کر دیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد یعنی رجب ۱۳۱۴ھ میں سید مرضِ سرطان میں مبتلا ہوئے اور اسی سال شوال کی پانچویں تاریخ کو وفات پائی۔ ان کے جنازے کو نہایت شان و احترام کے ساتھ اٹھایا گیا۔ اور ان کے مکان کے قریب قبرستان (شیخلر مزارلقی) میں دفن کر دیا گیا۔

سید جمال الدین جو مصر و یورپ میں شیخ جمال الدین کے نام سے مشہور ہیں، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ نہایت زبردست اور عجیب و غریب شخص تھے۔ ان کے ذریعہ اکثر اسلامی ممالک میں اتحاد اسلام کے جذبات پھیلے، افغانستان، ایران، ہندوستان، مصر اور ٹرکی میں انھوں نے بہت سے نمایاں کام انجام دیئے۔ لندن، پیرس اور پیٹرزبرگ میں وہ سیاسیات میں مشغول رہے۔ ان کی شخصیت نہایت زوردار تھی۔ وہ نہایت بارعب آدمی تھے۔ ان کی تحریر و تقریر دلوں میں اثر پیدا کرتی تھی۔ وہ فی الحقیقت بڑے آدمی تھے، اور لوگوں کے قلوب پر حکومت کرتے تھے، ان کی آنکھوں میں مقناطیسی قوت تھی، اور ان کی زبردست ایمانی قوت کے بعد اگر کوئی بزرگ ترین شے ان میں تھی تو وہ ان کی قوت بیانی تھی، ہر مباحثہ اور لکچر یا گفتگو کے وقت ان کی نظر لوگوں کے قلوب پر پڑتی تھی، ان کی قوت بیان اور بلاغت ہمیشہ غالب رہا کرتی تھی۔ عربی تحریر نہایت زوردار تھی اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے خطبوں سے

رسول اللہ صلعم کے خطبوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ فارسی لکھنے اور بول چال میں شاید افغانی محاوروں اور لہجہ کا تتبع کرتے تھے، اُن کی فارسی تحریروں[1] سے ان کے ایرانی ہونے میں اور زیادہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ان کا سب سے بڑا خیال اسلامی سر سبزی اور اتحادِ اسلام تھا۔ اسی کو وہ اسلام کی ترقی اور احیار عظمت کی بنیاد قرار دیتے تھے۔ اور اسی میں وہ یورپ کے غلبہ اور تسلط سے اسلام کی نجات مضمر سمجھتے تھے، مشار الیہ ہر لحاظ سے ایک زبردست اور جاذب ہستی تھی، لوگ ان کی صحبت سے خوش ہوتے تھے لیکن ان میں ایک حد تک تعلی کی عادت تھی اور زود خشم بھی تھے۔ وہ اپنے خیال میں جس امر کو حق خیال کرتے تھے! اسے کھلم کھلا اور بے محابا بیان کرتے تھے اور آئندہ خطرات کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے، وہ کسی چیز سے متاثر ہو کر میدانِ عمل سے نہیں ہٹتے تھے۔ لیکن وہ مدبر نہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں

---

[1] ان کا ایک فارسی خط جو ناصر الدین شاہ کے نام ارسال کیا گیا تھا اور جسے ناظم الاسلام کرمانی نے اپنی تالیف "تاریخ بیداری ایران" میں درج کر دیا ہے، ہمارے بیان پر شاہد ہے، ان کا ایک اور خط بھی جو ان کے ایک دوست کے نام (دیکھے از دوستان) بھیجا گیا تھا! اسی کتاب میں شائع ہو چکا ہے۔ وہ خط اصلی حالت میں نہیں ملا اور اس لئے ممکن ہے کہ وہ جعلی ہو ان کے ایک قابل اعتماد دوست نے جو دو سال تک ان کے ساتھ روس میں رہ چکا تھا۔ راقم الحروف سے یہ بات بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ حسن علی خان (امیر نظام) کو خط لکھنا چاہتے تھے اول، اول انھوں نے فارسی میں کچھ لکھا۔ لیکن چونکہ اس سے اُن کا اطمینان نہ ہوا اس لئے انھوں نے اسے پھاڑ ڈالا۔ اور عربی میں خط لکھا کیونکہ فارسی لکھنے پر وہ بہت حاوی نہ تھے۔

وہ گئے، انھوں نے لوگوں کو اپنا حاسد اور دشمن بنا لیا، مگر ان کے دوست اور
مریدان کے سچے نام لیوا اور عاشق تھے، اور وہ ان کی پرستش کرتے تھے،
جن وحشیانہ سختیوں کے ساتھ ان کا اخراج عمل میں آیا تھا۔ اور جس طریقہ سے
ان کی ٹانگوں کو باندھ کر جاڑے کے موسم میں خانقین تک لے گئے تھے،
اس کا اثر بدآخر عمر تک ان کے دل پر رہا۔ اور باوجود اس کے کہ اس تاریخ
سے پیشتر وہ نہایت چاق وتندرست تھے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد جب وہ لندن
پہنچے ہیں تو وہ بہت لاغر اور علیل ہو گئے تھے۔ ان کی عمر کا سب سے بڑا کام مصر
میں انجام دیا گیا۔ جہاں تقریباً نو سال تک لوگوں کو ان کی ذات سے فیض پہنچتا رہا
مصر کے مشہور و معروف مفتی محمد عبدہ اور بہت سے علماء و فضلاء اور مہدی سوڈانی
کے اکثر اصحاب ان کے شاگرد تھے۔ عربی، فارسی، ہمدانی ترکی اور اسلامبولی ترکی
(عثمانیہ تلوجہ) میں وہ خوب ماہر تھے۔ فرانسیسی زبان میں وہ بقدر کفایت بات
چیت کرتے تھے، اور فرانسیسی کتابوں اور رسائل کو زیر مطالعہ رکھتے تھے انگریزی
اور روسی جو ٹوٹی پھوٹی انھیں آتی تھی! اس کی وجہ سے لندن اور پیٹرز برگ میں ان کا
قیام تھا، شاید پشتو اور اردو بھی اتنی ہی آتی ہوگی۔ کتب عربی و فارسی کو وہ بہت یاد
پڑھتے تھے، اور کتب فرانسیسی کا بھی ایک حد تک مطالعہ کرتے تھے اپنی تصنیف تاریخ
الافغان" میں مشہور فرانسیسی عالم لنورمان LENORMAN کے اقتباسات درج کئے
ہیں۔ ان کی فقط دو کتابیں یادگار رہ گئی ہیں ایک فارسی میں "ردّ نیچریہ" اور دوسری
عربی میں "تاریخ الافغان"[1] اخبار عروۃ الوثقیٰ، اور ضیاء الخافقین میں جو مضامین

---

[1] یہ مفید کتاب مصر میں چھپ گئی ہے۔ کتاب ام القریٰ جو مصر میں چھپی ہے! اور محض
قصہ کے طور پر لکھی گئی ہے! اور جس میں مختلف ممالک اسلامی کے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

ان کے قلم سے نکلے تھے، وہ بھی باقی ہیں، متارالیہ کو زندگی سے کچھ اعتنا نہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مال و دولت جمع نہیں کی۔ طہران میں ایک مرتبہ ناصر الدین شاہ نے ہزار تومان اور ایک ہیرے کی انگشتری ان کے پاس تحفتہً بھیجی، انھوں نے روپیہ کو واپس کر دیا اور انگوٹھی کو میزبان کے اصرار سے رکھ لیا اور اس کو بھی بالآخر اپنے میزبان کے صاحبزادے کو دے ڈالا، سید جمال الدین ترقی و وجاہت پسند مسلمان تھے اور انھیں اسلام کا سچا عشق تھا۔ وہ اگرچہ متعصب نہ تھے لیکن وہ دین میں کسی انحراف کے پیرو نہ تھے۔ پطرس بستانی کے انسائیکلوپیڈیا میں جو مضمون انھوں نے مذہب کے باب پر لکھا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس فرقے کے متعلق اچھے خیالات نہ رکھتے تھے۔

جن یورپین مصنفین نے سید کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ ان سب نے ان کی بزرگی اور بڑائی کا اقرار کیا ہے۔ لیکن ان کی تعریف میں کم و بیش مبالغہ بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر براؤن جن کے مشرق اور ایران کے متعلق خیالات کا سب کو علم ہے اور جنھوں نے ۱۳۰۹ھ کے آخر میں مرزا ملکم خاں کے مکان میں ان سے ملاقات کی تھی۔ اپنی کتاب "تاریخ انقلاب ایران" میں سید جمال الدین

(بقیہ صفحہ گزشتہ)
علماء کو باہمی مشورہ کی غرض سے مکہ معظمہ میں مجتمع دکھایا گیا ہے اور ہر ایک مقرر کی تقریر بھی درج کی گئی ہے، درحقیقت ایک فرضی قصہ ہے جس کے مصنف مرحوم سید عبدالرحمٰن کواکبی حلبی ہیں نہ کہ جمال الدین بعض حلقوں میں اس کتاب کو سید جمال الدین سے غلطی سے اس بنا پر نسبت دی جا رہی ہے کہ انھوں نے واقعاً مکہ میں اس قسم کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔

کی زندگی کے حالات پوری شرح وبسط سے لکھنے کے بعد نہایت محبت آمیز الفاظ کے ساتھ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "یہ بزرگ شخص ایک زبردست سیاح اور عالم تھا۔ اور باوجود اس کے کہ دولت دنیا میں سے ایک فصیح زبان و قلم، وسیع علم، سیاسی فہم و فراست، معلومات مختلفہ اور اسلام (جس کے انحطاط کو وہ اپنے دل میں محسوس کرتے تھے) کے لئے سچے عشق کے سوائے ان کے پاس اور کچھ نہ تھا، تاہم یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے اور حرف بحرف صحیح ہے کہ انھوں نے بادشاہوں کے تخت و تاج کو ہلا دیا تھا اور مدبرین یورپ کی بعض متفقہ تجاویز کو درہم برہم کر دیا تھا۔ انھوں نے ان غیر معلوم قوتوں کو استعمال کیا جن کی جانب مشرق و مغرب کے سیاست دانوں میں سے کوئی شخص ابھی ملتفت نہ ہوا تھا اور نہ کسی کے ذہن میں اُن سے فائدہ اٹھانے کا کبھی خیال ہی آیا۔ انھی کے ذریعے مصر میں حب الوطنی اور مذہبی اتحاد کے جذبات پھیلے......"

ولفرڈ بلنٹ اپنی کتاب "گارڈن خرطوم" میں جمال الدین کے بارہ میں بلسوط حال لکھنے کے بعد کہتا ہے کہ "جمال الدین ایک بڑے شخص تھے۔ ان کی تعلیمات میں ایک خاص اثر اور کشش پائی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آخری ۳۰ سال میں دنیائے اسلام میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ہوا۔ میں اپنے تئیں بہت زیادہ مفتخر اور مشرف سمجھتا ہوں کہ وہ انگلستان میں میرے یہاں تین مہینے تک مقیم رہے لیکن وہ اپنے خیالات کے پکے تھے اور پورے طور پر ایشیائی تھے۔ اور آسانی کے ساتھ یورپین رسوم و آداب سے مانوس نہیں ہوتے تھے۔"

مشار الیہ کی شکل و شباہت اور ذاتی خصوصیات حسب ذیل تھیں۔ وجیہ توانا اور قوی الجثہ، رنگ سیاہی مائل گہرا تھا۔ صورت میں عرب معلوم ہوتے تھے

آنکھیں چمکدار تھیں، بہت قریب سے پڑھنے کے عادی تھے لیکن عینک کا کبھی استعمال نہیں کیا، ان کے سر کے بال بلند تھے اور خوبصورت۔ زیادہ تر علمائے اسلامبول کا لباس زیب تن کرتے تھے، غذا کم تھی اور اکثر دن میں ایک بار کھانا کھاتے تھے مگر چائے کے بہت زیادہ شائق تھے۔ چرٹ پینے کے عادی تھے۔ مگر صرف یورپ اور ٹرکی میں، سوتے بہت کم تھے اور آہستہ آہستہ اور رک رک کر باتیں کرتے تھے، قوت حافظہ بہت تیز تھی، اور فرانسیسی زبان کو کسی استاد کی مدد کے بغیر بقدر ضرورت صرف تین مہینے میں حاصل کر لیا تھا۔

سید جمال الدین کے حالات زندگی ختم کرلنے کے بعد ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر قسم کی تحقیق و تدقیق اور تجسس و تلاش کے باوجود مشارالیہ کے بہت سے واقعات پردۂ تاریکی میں مخفی رہ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مرزا باقر بوانانی کی روایت ہے جو لندن میں سید کے ساتھ نشست و برخاست رکھتے تھے اور جنھوں نے راقم الحروف کے ایک دوست سے اسے بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ جس زمانے میں مرزا باقر کی عین عالم جوانی میں شیراز میں تکفیر کی گئی اور وہ بھاگ کر بوشہر چلے گئے اور لوگ انھیں پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے پیچھے گئے اور انھیں گرفتار کر کے لئے جاتے تھے کہ کسی مولوی سے فتوائے قتل حاصل کر کے انہیں مار ڈالیں، عین اس زمانے میں سید جمال الدین بوشہر سے آرہے تھے اور شیراز جانا چاہتے تھے، لوگوں کو جب ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ ان کی خدمت میں لے گئے۔ سید نے بلا تامل مرزا باقر کے منہ پر طمانچہ مارا اور اس کی نسبت "ملعون کافر" وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے۔ اس کے بعد لوگوں سے کہا کہ اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ تاکہ اس سے قبولِ جرم کراؤں۔ اور کل صبح اس کے قتل کا حکم دیدوں

مجمع یہ سننے کے بعد منتشر ہوگیا۔ اور مرزا باقر کو سید کے مکان میں محبوس کر دیا گیا نصف شب گزر لنے پر سید آہستگی سے مرزا باقر کی کوٹھڑی میں گئے اور اسے بیدار کر کے کہا فی الفور فرار ہو جاؤ، اور اس طریقہ سے وہ ان کی نجات کا باعث بنے، بعد میں مرزا باقر نے سید جمال الدین کو دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے مجھے نجات دلائی تھی، اگر یہ روایت درست ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید ایران میں دو مرتبہ آنے کے علاوہ تیسری مرتبہ بھی ابتدائے جوانی میں ایران آئے تھے اور بوشہر کی راہ طہران یا اصفہان گئے تھے۔

علاوہ ازیں اعتماد السلطنت بھی اپنی کتاب "المآثر والآثار" میں لکھتے ہیں کہ سید ابتدائے جوانی میں بمقام قزوین علوم شرعیہ حاصل کرنے کے بعد طہران گئے تھے، لیکن یہ امر پورے طور سے معلوم نہ ہوسکا کہ آیا تحصیل علوم انھوں نے ہمدان ہی کی یا قزوین، طہران، مشہد یا کابل میں۔

ان کے ایک دوست جو ان کی پہلی سیاحت میں مدت تک ان کے ہم سفر رہے تھے، اور روس میں ان سے دوبارہ ملاقات کی تھی۔ یہ بیان کرتے ہیں کہ سفر اول میں طہران میں ایک نوجوان شخص جس کی نسبت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سید کا بھانجا ہے۔ سید کے ساتھ رہتا تھا، اس زمانے میں سید کے پاس عربی کی کتابوں کے دو تین صندوق تھے جنھیں انھوں نے جوان مذکور کے ہاتھ ہمدان بھیج دیا تھا۔ یہی راوی ناقل ہے کہ سید یقیناً ایرانی تھے اور خود اس سے بیان کرتے تھے کہ میں نے اپنی جوانی کے دن افغانوں میں بسر کئے ہیں۔ مشارالیہ افغانوں سے بہت دوستی اور میل جول رکھتے تھے۔

از مولانا ظفر علی خاں

سیّد محمدؐ جمال الدین الافغانؒ

یورپ کو اگرچہ فطرتِ انسانی کے ماہر اور حقائق نفس الامری کے نقاد ہونیکا بہت بڑا دعویٰ ہے۔ لیکن پھر بھی وہاں کے دانش پژوہوں میں ہمیں ایسے اشخاص بکثرت نظر آتے ہیں جو صورت کو معنی پر ترجیح دے کر واقعات کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں اور اپنے پولیٹیکل دستور العمل کو مرتب کرتے وقت عمداً یا سہواً الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اسلامی اخوت ایک سیدھا سادھا جملہ ہے جس کے مفہوم میں برادرانہ یک جہتی اور باہمی ہمدردی و غمگساری کے وہ عمرانی اصول داخل ہیں جن کو دنیا کا کوئی اخلاقی فلسفہ مذموم و ناروا نہیں قرار دے سکتا۔ لیکن یورپ کے اہل قلم جن کے خیالات پر مسیحیت کا روغن چڑھا ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ "پان اسلامزم" کرتے ہیں اور یہ وہ نام ہے جس کے سنتے ہی مسیحیت کے پردۂ تصویر پر مجاہدانہ جوش اور کورانہ تعصب کی تصویر اتر آتی ہے۔ "زرد خطرے" اور "کالے خطرے" کے جملوں کی طرح جو چین و افریقہ کا شیرازہ بکھیرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ "پان اسلامزم" یعنی "اسلامی خطرے" کی ایجاد کی غایت یہ تھی کہ دنیا کی رہی سہی آزاد و خود مختار اسلامی طاقتوں کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے تاکہ یخ سکوتی

تثلیث کا واحد علم لہراتا ہوا نظر آئے اور مسیحیت صبح و مسا نقارۂ انا ولا غیری بجایا کرے۔ ورنہ اس اصطلاح کے موجدوں کو خود اچھی طرح معلوم ہے کہ "پان اسلامزم" اگر اس کا وجود دنیا میں کہیں ہے تو بجز اس کے اور کوئی مقصد نہیں رکھتی کہ مسلمانوں کی موجودہ خود مختارانہ حیثیت کو بلا مزید قطع و برید کے برقرار رہنے دیا جائے۔ بہ الفاظ دیگر مسلمانوں کو دوسروں کے پلاؤ قلیئے سے غرض نہیں۔ ان کی تمنا فقط اتنی ہے کہ ان کا دال دلیہ جس سے وہ اتحاد جسم و روح قائم رکھ سکیں ان سے نہ چھینا جائے! اگر اس تمنا کو قوت سے فعل میں لانا "پان اسلامزم" ہے۔ تب تو یہ تحریک درحقیقت موجود ہے اور اس کی نشانیاں ہمیں افغانستان ایران ٹرکی اور مراکو میں نظر آرہی ہیں جنھوں نے یوروپین طاقتوں کے طرز عمل اور واقعات کی موجودہ روش کو دیکھ کر اپنے مشترک خطرے کا احساس کرتے ہوئے بجز برادرانہ اتحاد کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا ورنہ اس تحریک کی حقیقت ایک کابوسِ خیالی سے زیادہ نہیں۔ جسے یورپ نے جان بوجھ کر اپنی غاصبانہ پیش قدمی اور متعدیانہ درازدستی کے سینے پر اہل مشرق کا منہ چڑانے کے لئے بٹھادیا ہے۔

اسلامی اخوت جس کا فقدان دنیائے اسلام کے موجودہ افسوسناک انحطاط کا ذمہ دار ہے وہ روشن اصول ہے جو مہاجرین و انصار کے عقد مواخذات کی مبارک رسم کی انجام دہی کے وقت سے لے کر اب تک ہر اُس مسلمان کا نصب العین بنا رہا ہے جس کے دل کو مبدا ر فیاض نے دردِ قومی عطا کیا ہو اور چونکہ سرمایۂ دردِ قومی کا سب سے بڑا خازن وہ واجب التعظیم طبقہ ہے جسے حضور سرورِ کون و مکان کی بارگاہ سے انبیائے بنی اسرائیل کی ہم پایگی کا درجہ عطا ہو چکا ہے لہذا کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں کسی

مجدد وقت عالم نے مسلمانوں کی پستی کو محسوس کر کے ان کی شیرازہ بندی کی کوشش نہ کی ہو اور ان میں وہ روح نہ پھونکنی چاہی ہو جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے جسم میں حلول کئے ہوئے تھی۔

سید محمد جمال الدین نوراللہ مرقدہٗ جن کے حالات ہم ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اپنے وقت کے ایک ایسے ہی مجدد تھے۔ جو راعیٔ عرب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گلے کی تتر بتر بھیڑوں کو ایک جگہ جمع کرنے کے لئے انیسیں صدی کے نصفِ آخر میں جب کہ دنیائے اسلام منتہائے ذلت کو پہنچ گئی تھی منجانب اللہ مامور ہوئے۔ افغانستان! ایران، مصر اور ٹرکی اس عجیب و غریب شخص کے فیضان سے یکساں بہرہ اندوز ہیں۔ لیکن اس کا سب سے بڑا احسان ایران پر ہے جس کے منقل جان میں وہ چنگاری ڈال کر جو ۱۹۰۸ء میں شعلہ انقلاب بن کر لپکی۔ اس نے حریت مساوات اور دستوری حکومت کے خیالات ملک میں پھیلا دیئے۔ روس ان خیالات کو دبا دینا چاہتا ہے۔ انگلستان روس کے دم جھانسے میں آکر اس جد وجہد کو جو ایرانی اپنی قسمت کی گرہ کو اپنی انگلیوں سے کھولنے کے لئے عمل میں لا رہے ہیں، غیر ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ جرمنی اپنا اُلّو اِن دونوں حریفوں کو جُل دے کر الگ سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کیا وہ سلطنت جو تین ہزار سال تک یونانیوں پارسیوں۔ عربوں، مغلوں۔ تاتاریوں۔ ترکوں اور افغانوں کا پیہم تختۂ مشق بنی رہنے پر بھی ہر بیرونی دستبرد کے بعد ققنس کی طرح اپنی راکھ میں سے نئے پر و بال لے کر پیدا ہوتی چلی آئی ہو۔ آج مٹ سکتی ہے؟ کیا وہ خطہ جس کی خاک سے مانی و زرتشت۔ رستم و افراسیاب۔ عبداللہ ابن میمون و حسن ابن صباح۔ فارابی و بو علی سینا۔ فردوسی و نظامی۔ سعدی و حافظ نے پیدا ہو کر انسان کیلئے

مذہبی عقلی۔ اخلاقی اور تخیلی۔ ادراکات کا اچھوتا سرمایہ چھوڑا ہو۔ اس قابل ہے کہ میٹ دیا جائے۔ کیا اُس سرزمین سے جس کی ذہانت آفرینیاں صوفیوں اسماعیلیوں، شیعوں، حروفیوں اور وہابیوں کے جانبازانہ و فدائیانہ معتقدات کا سرمایہ بن کر ایسے ایسے انقلابات برپا کرتی چلی آئی ہوں جن کی نظیر کوئی دوسرا ملک نہیں پیش کر سکتا اپنے آپ کو اغیار و اجانب کی دستبرد سے بچانے کی قابلیت چھین لی گئی ہے؟ کیا وہ ملک جس کے لٹریچر کی رنگینیاں آدھے ایشیا کی تخییل کا عنصر غالب ہوں اور جس کی تہذیب بزم عالم کی شمع کا فانوس ہو دنیا کے دل منت پذیر کا گوشہ نہیں ہو سکتا؟

انصاف پسند دل مرزا آقا خاں کرمانی کے ہم آہنگ ہو کر پکار اٹھیں گے

بہ ایراں مباد آں چناں روز بد	کہ کشور بہ بیگانگاں اوفتد
نخواہم زمانے کہ ایں نوعروس	بیفتد بزیر جوانان روس
بگیتی مباد آں کہ ایں حور دیس	شود ہمسر۔ لمر دسے (لارڈ) از انگلیش

روس جرمنی اور دوسری یورپین طاقتوں کے اس شکار سے تو ہمیں بحث نہیں جو تہذیب و شائستگی کی ٹٹی کی آڑ میں کھیلا جا رہا ہے۔ وہ اگر اپنا ضمیر بیچنے پر تلی ہوئی ہیں اور اپنی کشور کشایانہ خواہشوں ــــــــــ کی قربانگاہ پر دنیا کی کمزور و ناتواں قوموں کو بھینٹ چڑھائے بغیر مانتی ہی نہیں تو خداوند عالم بشرطیکہ وہ موجود ہے اور ضرور موجود ہے۔ ایک نہ ایک دن اُن سے سمجھ لے گا اور وہ اس طرح برباد ہوں گی کہ ان کا نشان تک باقی نہ رہے گا۔ لیکن ہمارا دل دکھتا ہے جب انگلستان پر جس کی بقا و بقا کے ساتھ ہماری بقا اور جس کی طاقت کے ساتھ ہماری سلامتی وابستہ ہے جس کی عظمت کا محل ہماری عقیدت کی بنیاد پر قائم ہے۔ دنیا اسی قسم کے

اعتراض کرتی ہے۔ جیسے وحشی روس یا بے اصول جرمنی پر کئے جاتے ہیں۔
ہم سات کروڑ مسلمانانِ ہند جو سلطنت برطانیہ کی پولیٹیکل ہیئت ترکیبی کا
جزو لاینفک ہیں اور جن کا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے لئے انگریزی حکومت
کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی جسم کے لئے جان کی۔ اس بات کے ہرگز
روادار نہیں ہو سکتے کہ انگلستان سے کوئی ایسی لغزش سرزد ہو جس کا خمیازہ
اس کے ساتھ نہ صرف ہمیں بلکہ کل ہندوستان کو کھینچنا پڑے۔ یہی وجہ ہے
کہ ہم نہیں چاہتے کہ وہ ایران میں وہی پالیسی اختیار کرے جو روس نے
اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے کہ اس پالیسی کا لازمی نتیجہ ایک دن یہ ہوگا کہ
جنوبی ایران کے ہندوستان میں ضم ہو جانے سے ہندوستان کا ڈانڈا
روس سے جا ملے گا۔ اور اس طور پر جو خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ وہ اُن
لوگوں سے مخفی نہیں جو روس کی عظیم الشان جنگی قوت اور اس کے مقابلہ
میں ہندوستان کی فوجی کمزوری سے واقف ہونے کے ساتھ ہی اس
بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ نقض عہد یورپین طاقتوں کے بائیں ہاتھ کا
کرتب ہے اور روس تو اس فن میں ید طولیٰ حاصل ہے۔

یہ بحث بیچ میں برسبیل استطراد آ گئی تھی۔ اب ہم اصل مضمون کی طرف
متوجہ ہوتے ہیں جس کا ماخذ پروفیسر براؤن کی وہ دل کشا اور دل آرا
تصنیف ہے جو ایران کے پولیٹیکل انقلاب کے متعلق انھوں نے حال ہی
میں شائع کی ہے۔ پروفیسر براؤن کو ایران اور ایرانیوں سے ایک خاص
الفت ہے اور جن لوگوں نے ان کی کتاب "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" پڑھی
ہے۔ وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ الفت ان کے دل میں کیوں گھر کئے ہوئے
ہے جس شخص نے تیس سال فارسی لٹریچر کے مطالعہ اور اس کی تنقید میں

گزارسے ہوں اور جسے اسلامی تمدن کی تصویر کے روشن رُخ دیکھنے کا بار بار موقع ملا ہو اُسے بھلا کیونکر نہ ایران سے محبت ہو اس محبت کا حق انھوں نے "انقلاب ایران" لکھ کر ادا کیا ہے اور جیسا کہ ان کا بیان ہے اس کتاب کے لکھنے سے ان کا یہ مقصود ہے کہ ان غلط فہمیوں کو جو انگلستان میں ایرانیوں کی طرف سے پیدا ہو گئی ہیں دور کریں اور اپنے ہموطنوں کے دل میں ہمدردی کا وہ جذبہ پیدا کریں جس کا ایران کو انگلستان پر حق ہے۔

پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ ابھی تک بحث طلب ہے کہ آیا بڑے آدمی بڑے واقعات کے ظہور پزیر ہونے کا باعث ہوتے ہیں یا بڑے واقعات خود بڑے آدمیوں کو پیدا کر لیا کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان دونوں کا وجود لازم و ملزوم ہے مسلمانوں کی آزادی اور ان کے باہمی اتحاد کی اس عظیم الشان تحریک میں جس کے اثرات خصوصیت کے ساتھ ایران و ٹرکی میں نمودار ہیں۔ کسی نے ایسا نمایاں حصہ نہیں لیا جیسا سید جمال الدین نے جن کی زبردست شخصیت متبحرانہ فضیلت۔ متہورانہ جرأت ان تھک مستعدی فصاحتِ تقریر بلاغتِ تحریر اور شاندار شکل و صورت بتائے دیتی تھی کہ وہ بہت بڑے مشاہیر روزگار میں سے ہیں۔ یہ جامع حیثیات شخص فلسفی مصنف خطیب اخبار نویس اور مدبر سبھی کچھ تھا۔ جو لوگ اس کے موافق تھے اسے بہت بڑا محبّ وطن جانتے تھے اور جو اس کے مخالف تھے اسے ایک خطرناک مفسدہ پرداز سمجھتے تھے۔ اس لئے وقتاً فوقتاً اکثر اسلامی ممالک اور یورپ کے متعدد پایہ تختوں کا سفر کیا۔ اور اپنے وقت کے بہت سے سربرآوردہ مشرقیوں اور مغربیوں سے مل کر ان میں سے بعض کو اپنا دوست اور اکثر کو اپنا دشمن بنایا۔

سید محمد جمال الدین موضع اسعد آباد میں کنار کے متصل مضافاتِ

کابل سے ہے ۱۲۵۴ھ (مطابق ۱۸۳۹ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید صفدر تھا۔ جو حسینی سید تھے اور اپنا سلسلۂ نسب مشہور و معروف محدث سید علی الترمذی کی وساطت سے حضرت شہید کربلا سے جا ملاتے تھے۔ ابھی وہ بچّہ ہی تھے کہ ان کے والد نے کابل میں جا کر اقامت اختیار کر لی بچپن ہی سے ان میں غیر معمولی ذکاوت و ذہانت کے آثار پائے جاتے تھے اور جب ان کا سن آٹھ سال کا ہوا تو سید صفدر نے اپنے ہونہار بیٹے کی معلمی کی خدمت خود انجام دینی شروع کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہو گئے اور نحو۔ بلاغت۔ تاریخ۔ فقہ۔ منطق۔ تصوف۔ فلسفہ۔ طبعیات۔ مابعد الطبعیات۔ ریاضی ہیئت۔ طب۔ تشریح ابدان وغیرہ کل اسلامی علوم و فنون میں انھوں نے منتہیانہ استعداد بہم پہنچائی۔

اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ہندوستان آئے اور یہاں ایک سال کئی مہینے رہ کر علوم مغربیہ میں کچھ دستگاہ حاصل کی۔ اس کے بعد بعزم حج بیت اللہ شریف کو روانہ ہوئے اور راستہ میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۲۷۳ھ (م ۱۸۵۷ء) میں مکہ معظمہ پہنچے۔ حج سے فارغ ہو کر انھوں نے اپنے وطن کو مراجعت کی اور امیر دوست محمّد خاں کے دائرۂ ملازمت میں داخل ہو کر امیر موصوف کے ہمراہ مہم ہرات پر گئے جس پر امیر کے ابن عم اور داماد سلطان احمد شاہ کا قبضہ تھا۔

امیر دوست محمّد خاں کا ۱۲۸۰ھ (م ۱۸۶۴ء) میں انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ امیر شیر علی خاں مسند نشین ہوا۔ نئے امیر نے اپنے وزیر محمّد رفیق خاں کی صلاح پر چل کر اپنے تین بھائیوں محمّد اعظم۔ محمّد اسلم اور محمّد امین کو قید کر دینا چاہا جن میں سے اول الذکر کی ملازمت سید جمال الدین نے اختیار کر لی تھی۔ تینوں بھائی اس منصوبے سے آگاہ ہو کر اپنے اپنے صوبے کو بھاگ گئے اور خانہ جنگی

شروع ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد اعظم اور اس کے بھتیجے عبدالرحمٰن خاں (سابق امیر افغانستان) نے پایۂ تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور عبدالرحمٰن خان کے والد محمد افضل کو جو غزنی میں قید تھا رہا کر کے تخت پر بٹھا دیا لیکن محمد افضل ایک سال کے بعد رہگرائے عالم باقی ہو گیا! ور اس کی جگہ محمد اعظم تخت نشین ہوا جس نے سید جمال الدین کو اپنا وزیر اعظم بنایا۔ اگر اپنے وزیر باتدبیر کے کہے پر چلتا تو کل ملک اس کے قبضے میں آجاتا لیکن چونکہ وہ اپنے تمام رشتہ داروں کو حسد اور رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور بجز اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے جسے ملک داری کا کوئی تجربہ نہ تھا کسی کو ذمہ داری کی کوئی خدمت نہ دینا چاہتا تھا لہذا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

امیر شیر علی خاں ابھی تک قندھار پر قابض تھا۔ محمد اعظم کے ایک بیٹے نے اس خیال سے کہ شجاعت کا کوئی نمایاں کارنامہ دکھا کر باپ کے دل میں گھر کرلے چچا پر حملہ کیا لیکن چونکہ ناتجربہ کار تھا۔ اس لئے دو سو جوانوں کے ساتھ اپنی فوج سے الگ ہو کر آگے بڑھا۔ اور شیر علی خاں کے ایک سردار یعقوب خاں کے قابو میں آگیا۔ اس کامیابی نے شیر علی خاں کی ہمت بڑھا دی چنانچہ اس نے سلسلۂ جنگ وجدل کو پوری سرگرمی کے ساتھ از سر نو چھیڑ دیا۔ اور انگریزوں کی مدد سے جنھوں نے روپیہ سے اس کی خاطر خواہ مدد کی۔ وہ بالاخر اپنے بھائی محمد اعظم خاں اور بھتیجے عبدالرحمٰن خاں کی متفقہ قوتوں پر غالب آیا شکست کھا کر محمد اعظم خاں نے نیشاپور کی طرف راہ فرار اختیار کی جہاں چند مہینے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور عبدالرحمن خاں بخارا کو چلا گیا۔

سید جمال الدین اس انقلاب کے بعد بھی بدستور کابل میں مقیم رہے اور چونکہ سید تھے اور لوگ ان کو مانتے تھے اس لئے شیر علی خاں کے انتقام سے محفوظ رہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ افغانستان سے چلے جائیں۔

چنانچہ انھوں نے حج بیت اللہ سے مکرر مشرف ہونے کی اجازت امیر سے مانگی امیر کو چونکہ یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ مبادا وہ اپنے سابق ولی نعمت محمد اعظم خاں سے مل کر فتنہ وفساد برپا کریں لہذا حج کرنے کی اجازت ان کو اس شرط کے ساتھ دی گئی کہ وہ ایرانی علاقے میں سے نہ گزریں۔ غرض سید صاحب ۱۲۸۵ھ (م ۱۸۶۹ء) میں براہ ہندوستان مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ گورنمنٹ ہند نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ سربرآوردہ مسلمانوں سے بلا کسی انگریزی عہدہ دار کی نگرانی کے ملنے نہ پائیں اور ایک مہینے کے بعد اپنے ایک جہاز پر سوار کرا کے باعزاز تمام سوئز کو روانہ کر دیا۔ سوئز سے وہ قاہرہ گئے اور چالیس روز تک وہاں مقیم رہے۔ اس عرصہ میں وہ برابر جامعہ ازہر کو جاتے رہے اور وہاں کے اساتذہ وتلامذہ سے علمی مباحث پر گفتگو کرتے رہے اور اپنے مکان پر چند خاص خاص لوگوں کو درس بھی دیتے رہے۔

قاہرہ سے سید جمال الدین کا قصد مکہ معظمہ جانے کا تھا۔ لیکن اس قصد کو ملتوی کر کے وہ سیدھے قسطنطنیہ چلے گئے۔ جہاں ہز ہائینس علی پاشا وزیر اعظم اور دار الخلافہ کے دوسرے اکابر واعیان نے ان کا نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا۔ چھ مہینے تک قسطنطنیہ میں مقیم رہنے کے بعد وہ انجمن دانش کے رکن مقرر کیے گئے جو فرینچ اکاڈمی کی طرح ترکوں کی قومی مجلس علوم وفنون ہے اور ماہ رمضان ۱۲۸۷ھ (م دسمبر ۱۸۷۰ء) میں دار الفنون یعنی عثمانی یونیورسٹی کے ناظم اعلیٰ تحسین آفندی نے ان سے استدعا کی کہ طلبہ کو ایک لکچر دیں۔ پہلے تو انھوں نے اس بنا پر معذرت کی کہ ترکی زبان میں انھیں کافی مہارت حاصل نہیں۔ ہے لیکن بالآخر رضامند ہو گئے۔ انھوں نے اپنی تقریر ترکی زبان میں اس

قلمبند کر کے صفوت پاشا وزیر سر رشتہ تعلیمات اور شروانی زادے وزیر سر رشتہ پولیس منیف پاشا کو دکھائی اور ان سب نے اسے پسند کیا۔ لیکن شیخ الاسلام حسن آفندی سید صاحب کو بہ نگاہ حسد دیکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کے روز افزوں رسوخ و اثر کو کسی طرح صدمہ پہنچائے۔ جب سید صاحب نے اپنی تقریر اعیان و اکابر پایہ تخت کے بھرے مجمع کے سامنے جس میں بہت سے سر برآوردہ عثمانی ارکانِ دولت اور اخبار نویس اور ارباب فضل و کمال شریک تھے پڑھنی شروع کی تو حسن فہمی آفندی اس تاک میں تھا کہ کوئی فقرہ اس تقریر میں ایسا ہاتھ آجائے جس سے مقرر کے عقائد کی صحت پر خردہ گیری کی جاسکے۔ سید صاحب نے اپنی تقریر میں نظام تمدن کو ایک زندہ و متحرک جسم ذوی الاعضا سے تشبیہ دے کر بیان کیا تھا کہ اس جسم کے اعضا مختلف حرفے اور پیشے ہیں۔ مثلاً بادشاہ اگر دماغ ہے تو لوہار ہاتھ ہیں۔ کاشتکار جگر ہیں۔ ملاح پاؤں ہیں۔ وقس علی ہذا اس تمہید کے بعد سید صاحب نے کہا کہ انسانی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن جسم بغیر روح کے زندہ نہیں رہ سکتا! انسانی جماعت کے جسم کی روح ملکۂ نبوت ہے یا ملکۂ تفلسف۔ اگرچہ ان دونوں میں بھی یہ امر ما بہ الامتیاز ہے کہ نبوت ایک انعام مذہبی ہے جو کوشش سے نہیں ہاتھ آتا بلکہ اس شخص کو ملتا ہے جسے جناب باری کی عنایت خاص اس کا مستحق خیال کرے۔ اور دوسرا ملکہ یعنی فلسفیانہ قوتِ اکتسابی ہے جو غور و فکر اور مشاہدہ و تجربہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان ملکات دوگانہ میں یہ فرق بھی ہے کہ پیغمبر غیر خاطی ہوتا ہے۔ حالانکہ فلسفی گمراہ ہو سکتا ہے اور اس سے خطا سرزد ہو سکتی ہے۔

شیخ الاسلام نے ان الفاظ سے وہ موقع نکال لیا جس کا وہ آرزو مند تھا

اور سید جمال الدین پر منصب نبوت کو پیشہ اور نبی کو پیشہ ور ظاہر کرنے کا الزام لگایا۔ سید صاحب کی طرف سے اس الزام کی تردید ہوئی اور مطبع و منبر اس بحث کی جولانگاہ بن گئے۔ شیخ الاسلام کو اپنی کٹھ حجتی کی پچ تھی اور سید صاحب کو اپنے دعوے پر اصرار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بحث طول کھینچ کر حد سے زیادہ تلخ ہوگئی اور دولتِ عثمانیہ کی طرف سے بخیال حفظ واماں سید صاحب کو ایما ہوا کہ کچھ عرصے کے لئے قسطنطنیہ سے چلے جائیں۔ اس پر انھوں نے دوبارہ مصر کا رُخ کیا۔ جہاں وہ ۲۲۔ مارچ ۱۸۷۱ء کو پہنچے۔

سید صاحب کا ابتداءً یہ قصد تھا کہ مصر میں محض برائے چندے قیام کریں لیکن یہاں پہنچ کر ریاض پاشا سے ان کی ملاقات ہوئی جس پر ان کے کمالات و فضائل کا یہاں تک اثر ہوا کہ اس نے گورنمنٹ مصر سے ان کا ایک ہزار پیاستر ماہانہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔ طالب العلم اور ارباب ذوق سلیم ان کے علم و فضل کا شہرہ سن کر جوق جوق ان کے پاس آنے لگے اور وہ ان لوگوں کے اشتیاق آمیز اصرار پر فقہ و حدیث فلسفہ و منطق و تصوّف کے منتہیانہ مسائل کی گتھیاں ان کے لئے سلجھانے لگے۔ مصر میں ان کی شہرت روز بروز بڑھتی گئی اور ان کا حلقۂ اثر جلد جلد وسیع ہوتا گیا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں میں انشا پردازی کا مذاق پیدا کرنے پر بہت کچھ توجہ صرف کی اور ادب۔ فلسفہ۔ مذہب۔ پالٹیکس ہر موضوع پر خامہ فرسائی کرنے کی انھیں ترغیب دلائی۔ اس وقت تک مصر میں گنتی کے اہلِ قلم موجود تھے مشہور انشا پردازوں میں عبداللہ پاشا فکری خیری پاشا محمد پاشا مصطفیٰ پاشا وہبی اور چند اور ادیبوں کا نام لیا جا سکتا۔ لیکن سید صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کی بدولت نوجوان طبقے میں مشاق اور نکتہ آفرین انشا پردازوں کی تعداد بہ سرعت تمام بڑھنے لگی اور ملک میں ایسے لوگ بکثرت پیدا ہوگئے جو

نہایت قابلیت کے ساتھ ہر مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار بہ آسانی کر سکتے تھے۔

لیکن قسطنطنیہ کی طرح مصر میں بھی سید صاحب کے کمالات نے خاص خاص لوگوں کو فرطِ حسد سے اُن کا دشمن بنا دیا۔ پُرانی وضع کے علما کا ان پر یہ اعتراض تھا کہ وہ احیائے تعلیم فلسفہ میں ساعی ہیں۔ ادھر انگریزی قونصل جنرل مسٹر وویٖین نے جو بعد میں لارڈ وویٖین کے لقب سے ملقب ہوئے۔ سید صاحب کی پولٹیکل سرگرمیوں کو بہ نگاہِ اشتباہ دیکھ کر توفیق پاشا خدیو مصر سے ان کے اخراج کا حکم جاری کرا دیا۔ چنانچہ وہ اپنے جاں نثار شاگرد ابو تراب کے ساتھ جو کبھی مجتہد العصر آقا سید محمد طباطبائی کے متوسلین میں تھا اور اس وقت سید صاحب کا ارادت مند حلقہ بگوش تھا ماہ دسمبر ۱۸۷۹ء میں مصر سے روانہ ہو کر سیدھے ہندوستان پہنچے اور حیدر آباد دکن میں اقامت اختیار کی۔ زمانۂ قیامِ حیدر آباد میں انھوں نے ایک کتاب بزبان فارسی ملاحدہ کے رد میں لکھی جس کا بعد میں عربی ترجمہ بھی ہو گیا۔ اصل کتاب ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اور اس کا ترجمہ بمقام بیروت ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔

یہاں برسبیل تذکرہ یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے شروع میں سید صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی کے سوانح اور خاندانی حالات تمہیداً خود سپردِ قلم کئے ہیں۔ سید صاحب کے واقعاتِ زندگی کو دوسرے لوگوں نے بھی قلمبند کیا ہے مثلاً جرجی زیدان نے اپنی کتاب "مشاہیر الشرق" میں جو بمقام قاہرہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ سید صاحب کی مبسوط سرگزشت لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ناظم الاسلام کرمانی نے حال میں ایک کتاب "تاریخ بیداریٔ ایرانیاں" کے نام سے تصنیف کی ہے جس کے مقدمہ ایک بڑا حصّہ سید صاحب کے سوانح عمری کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ مصری رسالہ "المنار" میں سید صاحب کی بوقلموں اور عجیب و غریب زندگی کے ہر پہلو پر تفصیلی اور انتقادی نظر حال ہی میں ڈالی گئی ہے۔ لیکن یہ مختلف سوانح سید صاحب کے مقام ولادت کے

متعلق متفق البیان نہیں ہیں۔ صاحبِ "تاریخ بیداریٔ ایرانیان" کا بیان ہے کہ سید جمال الدین اسعد آباد میں جو مضافاتِ کابل سے نہیں ہے۔ بلکہ اسعد آباد میں پیدا ہوئے جو ہمدان سے، فرسنگ اور گنگادر سے ۵ فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسلئے وہ حقیقت میں ایرانی الاصل تھے۔ لیکن افغان وہ اپنے آپ کو اس لئے کہتے تھے کہ چونکہ وہ سنی المذہب تھے! اس لئے ایران میں اُن سے کوئی معترض نہ ہو۔ اس کے علاوہ ایرانی گورنمنٹ اپنی رعایا کے حقوق کی کافی حفاظت نہیں کرتی۔ صاحب "تاریخ بیداریٔ ایرانیان" ہی کا یہ خیال نہیں۔ بلکہ تمام ایرانی سید صاحب کو اپنا ہموطن سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسی حالت میں جبکہ سید صاحب خود بصراحت بیان کرتے ہیں کہ وہ افغان ہیں صاحب "تاریخ بیداریٔ ایرانیان" اور اس کے ہم آہنگوں کی کمزور اور بودی دلیلیں سید صاحب کے دعوی کی تردید میں باور نہیں کی جاسکتیں۔ اگر ایرانی شیعیت کے خوف سے انھوں نے اپنے آپ کو باوجود ایرانی الاصل ہونے کے افغان مشہور کیا اور شیعیان ایران ایسے ہی متعصب ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اسی شیعہ دنیا پر ایک سنی عالم ایسا گہرا اور ہمہ گیر اثر ڈال سکا۔ یہ خیال بھی مضحکہ انگیز ہے کہ چونکہ اُنھیں ایرانی گورنمنٹ کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ اپنی رعایا کو بچا نہیں سکتی لہذا وہ افغان کہلانے لگے۔ اگر یہی خیال تھا تو انھوں نے اپنے آپ کو عثمانی کیوں نہ مشہور کیا۔ اس کے علاوہ بقول پروفیسر براؤن کے اگر وہ اسعد آباد ہی میں پیدا ہوئے ہوتے تو افغانستان کے پالٹیکس سے جو گہرا تعلق اُنھیں ۱۸۶۵ء تک رہا۔ اس کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے۔

القصہ ۱۸۸۲ء میں "نوجوان مصریوں" کی وہ تحریک جس سے سید جمال الدین کو پوری ہمدردی تھی اور جس کا ابتدائی مقصد یہ تھا کہ خدیو کی مصرفانہ عادات اور غیر محدود اقتدارات کی اصلاح کر کے اغیار کی مداخلت اور مقابضت کا سدباب کیا جائے

عربی پاشا کے خروج۔ اسکندریہ کی گولہ باری۔ تل الکبیر کی لڑائی اور برٹش قبضہ پر جا ختم ہوئی جنگ کے شروع ہونے سے پہلے گورنمنٹ ہند نے سید جمال الدین کو حیدر آباد سے کلکتہ بلا لیا۔ اور جب تک مصری قوم پرستوں کو شکست نہ ہو گئی انھیں وہیں روکے رکھا۔ اس کے بعد انھیں ہندوستان سے رخصت ہونے کی اجازت دی گئی چنانچہ کلکتہ سے وہ پہلے لندن اور وہاں سے پیرس گئے۔ جہاں وہ تین سال تک رہے۔

زمانہ قیام پیرس میں ان کے دوست اور شاگرد شیخ محمد عبدہٗ مرحوم مفتی مصر ان سے ملے۔ شیخ محمد عبدہٗ کی ملاقات ان سے قاہرہ میں اول اول ۱۸۷۱ء میں ہوئی تھی اور اس کے بعد سے دونوں میں رشتہ محبت و یگانگت روز بروز بڑھتا گیا تھا شیخ کو ۱۸۸۲ء کے ہنگامہ میں حصہ لینے کی وجہ سے جلا وطنی کی سزا دی گئی تھی اور وہ سیدھے پیرس چلے آئے تھے۔ دونوں نے مل کر ایک ہفتہ وار عربی اخبار "العروۃ الوثقٰی" نکالا جس میں زیادہ تر پولیٹیکل مباحث ہوتے تھے اور جس کا لہجہ انگلستان کے خلاف تھا۔ یہ اخبار ساڑھے چار مہینے سے زیادہ نہ نکلنے پایا۔ اس لئے کہ انگریزی گورنمنٹ نے اس کے پرجوش حملوں سے ڈر کر اور اس کے روز افزوں اثر سے خائف ہو کر ہندوستان میں اس کا داخلہ بند کر دیا۔ اور غالباً دوسرے ذرائع سے بھی کام لیا جنھوں نے اُس کی شمع ہستی کو گل کر دیا۔

زمانہ قیام پیرس میں سید صاحب نے فرانسیسی زبان سیکھنی شروع کی۔ اور اس میں کافی دستگاہ بہم پہنچائی۔ یہیں سے یورپ کے مختلف سر برآوردہ اخباروں اور رسالوں میں آپ نے مضامین لکھے اور مشہور فرانسیسی مستشرق رینان کے ساتھ مسئلہ اسلام و سائنس پر علمی مناظرہ میں مصروف رہے۔ انگلستان، روس، ٹرکی اور مصر کے متعلق ان کے پولیٹیکل مضامین کا اقتباس انگریزی اخباروں میں بکثرت شائع ہوتا رہا۔ اور اس زمانہ کے انگلش مدیروں کا ان کی نسبت یہ خیال تھا کہ اس عجیب و غریب آدمی سے ڈرتے رہنا چاہئے۔

اسی زمانہ یعنی ۱۸۸۵ء میں سید جمال الدین لندن گئے اور لارڈ رنڈالف چرچل، سر ڈرمنڈ وولف اور لارڈ سالسبری سے ملے۔ جو مہدی سوڈانی کے متعلق ان کے خیالات دریافت کرنا چاہتے تھے۔ اور مسٹر ونفرڈ بلنٹ نے جو مصری معاملات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ لارڈ سالسبری کی یہ تمنا تھی کہ اگر ممکن ہو تو سید جمال الدین کے ساتھ مناسب شرائط پر سمجھوتہ ہو جائے۔

جب عروۃ الوثقی بند ہو گیا۔ تو سید جمال الدین پیرس سے پہلے ماسکو اور وہاں سے سینٹ پیٹرسبرگ گئے۔ جہاں روسی گورنمنٹ نے ان کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ سینٹ پیٹرسبرگ میں ان کا قیام چار سال تک رہا۔ اور اس زمانہ میں انھوں نے مسلمانان روس کے ساتھ وہ احسان کیا جسے ان کی آئندہ نسلیں بلکہ کل مسلمانانِ عالم فراموش نہ کر سکیں گے۔ روس میں مسلمانوں پر حکومت کی طرف سے جو جبر و تشدد ہوتا تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ انھیں کلام مجید اور دوسری کتب مذہبی کے چھاپنے تک کی اجازت نہ تھی۔ سید جمال الدین نے زار کو اس ظالمانہ حکم کی تنسیخ پر آمادہ کیا اور ان کی کوششوں سے مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو گئی وہ آزادی جو انھیں جان سے زیادہ پیاری ہے لیکن جسے وحشی اور ظالم حکومت نے اُن سے بجبر چھین رکھا تھا۔ کیا اس واقعہ کو پیش نظر رکھ کر ہم مسلمانانِ ہند کو درگاہ ربُّ العزت میں سجدۂ شکر نہ بجالانا چاہیئے کہ ہماری قسمت کی باگ ایک ایسی شریف النفس اور مصلحت اندیش قوم کے ہاتھ میں دیدی گئی جس کی جہانداری کے دستور العمل کا پہلا اصول موضوعہ یہ ہے کہ رعایا کو کامل مذہبی و عمرانی آزادی دی جائے۔ اور اُن کے عقائد کا پورا ادب ملحوظ رکھا جائے۔ علمائے اسلام نے ہندوستان کو اگر دارالحرب نہیں سمجھا بلکہ دارالاسلام قرار دیا ہے تو ان کا یہ فتویٰ بے وجہ نہیں ہے۔

سید جمال الدین ابھی پایۂ تخت روس ہی میں مقیم تھے کہ ناصر الدین شاہ

فرمانروائے ایران بہ تقریب سیاحت یہاں وارد ہوئے۔ اور سید صاحب سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ سید صاحب نے از راہِ غایت استغنا کجکلاہ شاہ کے پیام کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن

قابل تغییر نبود آنچہ تعیین کردہ اند

دونوں کی ملاقات اور وہ نتیجہ جو اس سے مرتب ہونے والا تھا مقدر ہو چکا تھا۔ کچھ دن بعد میونک میں سید صاحب شاہ سے ملے اور شاہ نے یہ کہہ کر کہ میں آپ کو صدرِ اعظم مقرر کر دوں گا۔ ان سے بہ اصرار تمام ایران چلنے کو کہا۔ اول تو سید صاحب نے انکار کیا۔ لیکن پھر بعض مصلحتوں سے رضامند ہو گئے۔ اگرچہ ان کے دوست شیخ عبد القادر مغربی اُن کو بار بار متنبہ کرتے رہے کہ ایسی حالت میں جب کہ آپ کو سُنّی عقائد میں اس درجہ غلو ہے اور ملّتِ حنفیہ کی تقویت اور استحکام میں آپ کی مساعی جمیلہ الم نشرح ہو رہی ہیں۔ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ناصر الدین شاہ آپ کو صدارتِ عظمیٰ کے منصبِ جلیلہ پر مامور کرے۔ سید جمال الدین نے جن کی زندگی کی غایت الغایات سُنّی اور شیعی دنیا کا باہمی اتحاد تھی۔ اپنے دوست کا یہ فقرہ سن کر زبان سے تو اپنی غلطی کا اعتراف کیا لیکن اپنے مقصدِ اصلی کو پیشِ نظر رکھ کر دل میں یہ کہا۔

شاید کہ ہمیں بیضہ بر آرد پر و بال

اور شاہ کے ساتھ ہو لیے۔ شیخ عبد القادر مغربی نے شیعیت اور حنفیت کے تخالف کو سید جمال الدین کی ہمرکابی شاہ کجکلاہ کا عناں گیر خیال کیا تھا۔ یہ خیال تو صحیح نہ تھا البتہ دوسری قوی وجوہ ایسی تھیں جو شاہ کی سلکِ ملازمت میں سید صاحب کے منسلک ہونے کی روادار نہ تھیں۔ دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ سید جمال الدین شیدائے حرّیت۔ ناصر الدین شاہ دل دادۂ استبداد۔ ایک قومی حقوق کی حمایت میں سینہ سپر۔ دوسرا ان حقوق کی پائمالی پر ثابت قدم۔ ایک جمہوری آئین کا

آرزومند۔ دوسرا مطلق العنان شخصی اقتدارات کا متمنی۔ دونوں میں میل ہوتا تو کیونکر ہوتا۔ یہ اختلافِ طبائع بہت جلد رنگ لایا۔ طہران آئے ہوئے سید جمال الدین کو زیادہ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ وہ عارضی روغن جو یورپ کے سفر نے ناصر الدین شاہ پر چڑھا دیا تھا اتر گیا۔ اور سید صاحب کے ساتھ بے اعتنائی برتی جانے لگی شاہ کے تیور بدلے ہوئے دیکھ کر سید صاحب نے مراجعتِ یورپ کی اجازت طلب کی جس کے دینے سے کسی قدر درشتی کے ساتھ انکار کیا گیا۔ اس پر سید صاحب درگاہ شاہ عبد العظیم میں جو طہران کے قریب واقع ہے بست یعنی امان لے کر بیٹھ گئے۔ اور اس درگاہ میں جو بوجہ اپنے تقدس کے آمن ہونے کے لحاظ سے حرم کا حکم رکھتی ہے سات مہینے تک رہے۔ زمانہ قیامِ درگاہ میں سید صاحب نے ناصر الدین شاہ کی کھلّم کھلّا مخالفت شروع کر دی۔ تقریر و تحریر میں وہ شاہ کی بے عنوانیاں بیان کرتے رہے اور اس کی معزولی کے جواز کی تائید میں سلسلۂ دلائل کو کبھی ٹوٹنے نہ دیا۔ بہت سے ایرانی جن میں ہر طبقہ و جماعت کے با اثر افراد شریک تھے اُن کے ہمخیال ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر ناصر الدین شاہ نے اُن کے ملک بدر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایران میں مقابر و معابد اور دیگر متبرک مقامات اور شاہی اصطبل اور توپخانے سے بست کا خیال وابستہ ہے یعنی جو مجرم یا مفرور کسی مقدس عمارت میں جا پناہ لے۔ یا شاہی طویلے میں چلا جائے حتیٰ کہ شاہ یا شاہی خاندان کے کسی گھوڑے کی دُم کو چھو لے۔ یا توپخانہ کی حدود کے اندر داخل ہو جائے وہ مامون و مصؤن سمجھا جاتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کو ان حدود کے اندر ضرر پہنچا سکے چنانچہ تاریخ ملکم میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ نادر شاہ کے پوتے نادر مرزا پر جس قدر مصیبتیں نازل ہوئیں۔ اُن کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے ایک مفرور کو جس نے شاہی اصطبل میں جا پناہ لی تھی مروا ڈالا تھا۔ درگاہِ شاہ عبد العظیم میں سید جمال الدین اسی خیال سے بست نشین

ہوئے تھے کہ اس کی مقدس چار دیواری میں کسی کو اُن سے معترض ہونے کا حوصلہ نہ ہوگا لیکن ناصرالدین شاہ کو اس درگاہ کی امن آفرین چار دیواری بھی اپنے فیصلے کی تعمیل سے نہ روک سکی۔ اس نے پانچ سو سواروں کا دستہ اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ سید جمال الدین جس حال میں ہوں۔ گرفتار کر کے ملک بدر کر دیئے جائیں۔ سید صاحب اس وقت بیماری کی وجہ سے صاحبِ فراش تھے۔ شاہی کارندوں نے اس کا بھی لحاظ نہ کیا اور انھیں بستر سے گھسیٹتے ہوئے درگاہ سے باہر لے آئے اور ترکی سرحد پر لے جا کر چھوڑ دیا۔ ناصرالدین شاہ کے اس طرزِ عمل نے سید جمال الدین کے وسیع حلقۂ احباب میں سخت برہمی پیدا کر دی اور یہی طرزِ عمل آگے چل کر ۱۸۹۶ء میں شاہ موصوف کے قتل کا ایک بہت بڑا باعث ثابت ہوا۔ پس مقام تعجب نہیں اگر عوام ایران کا یہ خیال یقین کے درجے تک پہنچ گیا ہو کہ ناصرالدین شاہ کو درگاہ شاہ عبدالعظیم کی بے حرمتی کی پاداش میں یہ سزا ملی۔

ایران سے سید جمال الدین کا اخراج اواخر ۱۸۹۰ء میں ہوا۔ سال ڈیڑھ سال تک کا زمانہ انھوں نے سفرِ یورپ میں گزارا۔ کچھ عرصہ تک وہ لندن میں رہے جہاں انھوں نے "ناصرالدین شاہ کی ظالمانہ حکومت" کو اپنا موضوع قرار دے کر بہت سے جلسوں میں تقریریں کیں، اور متعدد مضامین شائع کیے جن میں شاہ موصوف پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی گئی تھی اور اس کے صحیح الحواس ہونے میں تک شک ظاہر کیا گیا تھا۔

۱۸۹۲ء میں سید صاحب پھر قسطنطنیہ گئے۔ جہاں انھوں نے اپنی عمر کے بقیہ پانچ سال گزارے۔ سلطان عبدالحمید خان کے دل میں ان کی بڑی وقعت تھی۔ اور وہ سلطان کے مقربین خاص میں سے تھے۔ ایک دن سلطان المعظم نے سید صاحب سے فرمایا کہ سفیر ایران تین مرتبہ عرض کر چکا ہے کہ سید جمال الدین شاہ کجکلاہ پر سخت حملے کر رہے ہیں۔ اس کا سدِ باب ہونا چاہیے۔ ہم نے دو دفعہ تو اسے ٹال دیا لیکن تیسری دفعہ

اس سے وعدہ کیا کہ سید صاحب کی خدمت میں التماس کی جائے گی۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ اب اس بحث کے سر پر خاک ڈالیں۔ سید جمال الدین نے جواب دیا کہ جب خلیفۃ المسلمین ایسا ارشاد فرماتے ہیں تو میں شاہ ایران کو معاف کرتا ہوں۔ اس پر سلطان المعظم نے کہا کہ سید صاحب حقیقت یہ ہے کہ شاہ کجکلاہ آپ سے بہت ہی خائف ہیں۔ یہ خوف جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا بے وجہ اور بے بنیاد نہ تھا۔

جب یکم مئی ۱۸۹۶ء کو ناصر الدین شاہ کے قتل کے واقعہ نے جو مرزا محمد رضا کرمانی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا دنیا کے پولٹیکل حلقوں میں ایک کھلبلی سی ڈال دی تو اول اول حکومت ایران کو بابیوں پر شبہ ہوا۔ لیکن بعد میں سید جمال الدین اور ان کے رفقا مرزا آقا خان شیخ احمد کرمانی اور حاجی مرزا حسن خاں خیر الملک موردِ اشتباہ ہوئے۔ چنانچہ دولتِ ایران نے بابِ عالی سے ان چاروں کی حوالگی کی درخواست کی۔ کسی قدر ردّ و قدح کے بعد آخر الذکر تینوں اشخاص تو ایرانی حکام کے حوالے کر دیئے گئے۔ اور تبریز میں ان تینوں کی خفیہ طور پر گردن ماردی گئی لیکن سید جمال الدین کی تحویل سے سلطان عبد الحمید خاں نے انکار کیا۔ ناصر الدین شاہ کی مخالفت میں سید صاحب کا اس سرگرمی سے حصّہ لینا اور جس شخص نے شاہ کو قتل کیا۔ اس کا سید صاحب کے ہم خیالوں میں سے ہونا بجز اس کے کہ سید جمال الدین کو ایرانی حکام کی نظروں میں شاہ کے قتل کا محرک قرار دے اور کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گو سید صاحب ناصر الدین شاہ کو برا سمجھتے تھے اور اس کے دنیا سے اٹھ جانے پر ان کو افسوس بھی نہیں ہوا۔ پھر بھی یہ خیال کہ قتل ان کے ایما سے ہوا۔ اصلیت سے کوسوں دور ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ بابِ عالی نے سید صاحب کو دولتِ ایران کے حوالے نہیں کیا۔ اس عدم حوالگی کی بڑی وجہ تو یہ تھی کہ سید صاحب ایرانی رعایا نہ تھے بلکہ افغانی نژاد تھے اور اس کے علاوہ جب ان پر قتل ناصر الدین شاہ کے جرم میں

شریک و معین ہونے کا شبہ ہوا تو ۵ مئی ۱۸۹۶ء کو وہ قسطنطنیہ میں گرفتار کئے گئے۔ اور یلدیز کوشک میں ایک خاص عدالت کے سامنے اُن کے اظہارات لے کر ان پر جرح کی گئی! اس تحقیقات میں وہ بری الذمہ ثابت ہوئے اور رہا کر دیئے گئے۔

۱۸۹۶ء میں سید جمال الدین مبتلائے مرض سرطان ہوئے جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ ۹۔ مارچ ۱۸۹۷ء کو اٹھاون سال کی عمر میں ان کی بے چین روح جو مسلمانوں کی ترقی اور اسلام کے عروج کی فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں رہتی تھی جسم سے مفارقت اختیار کر کے رہگرائے دار القرار ہو گئی۔ ان کا جنازہ نہایت دھوم دھام سے نکلا۔ اور وہ "شیخلر مزارلغی" (مزار شیخ) میں جو متصل نشان تاش واقع ہے دفن کئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صاحبِ "مشاہیر الشرق" نے سید جمال الدین کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :-

اُن کا رنگ حجازی عربوں کی طرح سانولا تھا جسم دہرا تھا۔ قوا مضبوط تھے۔ آنکھیں سیاہ اور چمکدار تھیں۔ دور کی چیز کو بوجہ نقص بصارت اچھی طرح نہ دیکھ سکتے تھے۔ اور چونکہ عینک نہ لگاتے تھے۔ لہذا پڑھتے وقت کتاب کو آنکھوں سے ملائے رکھتے تھے۔ اُن کے بال لمبے تھے اور لباس وہی پہنتے تھے جو عام طور پر قسطنطنیہ کے علما استعمال کرتے ہیں۔ کھانا کم کھاتے تھے۔ اور دن میں عموماً ایک دفعہ سے زیادہ نہ کھاتے لیکن چاء ایرانیوں کی طرح دن بھر پیتے رہتے تھے۔ تمباکو بھی بہت پیتے تھے۔ اور اس میں یہ اہتمام تھا کہ اپنے پینے کا تمباکو خود خریدتے تھے۔ اکثر مشرقی سگریٹ پیا کرتے ہیں لیکن وہ سگار کو سگریٹ پر ترجیح دیتے تھے۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں جو انھوں نے قسطنطنیہ میں گزارے! انھیں سلطان المعظم کی طرف سے ۷۵ پاؤنڈ ماہوار کا وظیفہ ملتا تھا۔ نشان تاش میں ایک سجا سجایا مکان بھی سلطان نے اُن کی سکونت کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ اور ان کی سواری کے لئے گاڑی اور گھوڑے بھی

اصطبل سلطانی سے بھیجے جاتے تھے۔ وہ بالعموم دن بھر مکان پر رہتے تھے اور شام کے وقت گاڑی میں سوار ہو کر ہوا خوری کے لئے کیا غید خانہ یا قسطنطنیہ کی کسی اور تفریح گاہ کی طرف چلے جاتے تھے۔ وہ سوتے کم تھے۔ اور دیر میں سو کر بہت سویرے اٹھتے تھے۔ جو شخص اُن سے ملنے جاتا تھا۔ عام اس سے کہ وہ ادنی حیثیت کا ہو۔ یا بہت ہی بڑا درجہ رکھتا ہو۔ اس سے وہ بہ اخلاق و مہربانی پیش آتے تھے۔ لیکن لوگوں کے مکان پر خصوصًا بڑے درجے کے آدمیوں کے ہاں ملاقات کے لئے بہت کم جاتے تھے۔ تقریر اُن کی مؤثر و دل نشین اور فصیح و بلیغ ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ شستہ و پاکیزہ زبان استعمال کرتے تھے۔ سوقیانہ و پیش پا افتادہ محاوروں سے بچتے تھے۔ لیکن حتی الامکان تکلم الناس علی قدر عقولہم کے اصول کو پیش نظر رکھتے تھے۔ تقریر کرنے کے فن میں انھیں ید طولی حاصل تھا۔ اور مشرق بھر میں کم ایسے شخص ہوں گے جو ان کی ٹکر کے ہوں۔ ان کے انداز گفتار سے متانت اور تمکنت مترشح ہوتی تھی۔ اور استہزا دیا وہ گوئی سے وہ قطعًا ابا کرتے تھے۔ وہ تونگر تھے۔ مگر ان کی تونگری کا سرمایہ قناعت تھی۔ دنیا کے مال و متاع کی ان کو بہت کم پروا تھی۔ خطرے کے وقت وہ جری اور دلاور تھے۔ راستبازی اور شیریں اخلاقی ان کے خمیر میں داخل تھی۔ اگرچہ مزاج اشتعال پذیر ضرور تھا۔ جس سے ملتے تھے جھک کر اور منکسر المزاج ہو کر ملتے تھے لیکن بڑے آدمیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ آزادی و استغنا کی شان لئے ہوئے ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جب وہ مصر سے نکالے گئے تو سوئز میں بحالت تہیدستی پہنچے۔ ایرانی قونصل نے چند ایرانی سوداگروں کے ہمراہ جا کر انھیں کچھ روپیہ دینا چاہا۔ اور کہا کہ اس ناچیز رقم کو یا تو بطور ہدیہ قبول کیجئے اور یا قرض سمجھ کر لے لیجئے لیکن انھوں نے یہ کہہ کر رقم کے لینے سے انکار کر دیا کہ آپ اس روپیہ کو اپنے پاس ہی رکھئے۔ اس لئے کہ بہ نسبت میرے آپ اس کے زیادہ محتاج ہیں ۔

تو باز باش کہ صیدے خوری و لقمہ دہی　　　طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پر و بال

اُن کے قوائے عقلیہ و ممیزہ حیرت انگیز تھے۔ جو لوگوں کے دل میں ہوتا تھا ابھی وہ ظاہر بھی نہ ہونے پاتا تھا کہ ان کی قوت انتقال ذہنی اُس پر حاوی ہو جاتی تھی۔ ان کے کلام میں جادو کا سا اثر تھا۔ جو بات ان کی زبان سے نکلتی تھی سننے والے کے دل میں اتر جاتی تھی۔ اُن کی معلومات نہایت وسیع تھیں۔ فلسفہ قدیم۔ فلسفۂ تاریخ تاریخ اسلام۔ تمدنِ اسلام اور جملہ اسلامی علوم و فنون میں انھیں متبحرانہ دستگاہ حاصل تھی وہ ہشت زبان تھے۔ عربی۔ ترکی۔ فارسی اور پشتو کے علاوہ جو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ وہ انگریزی روسی اور فرانسیسی زبانیں بھی جانتے تھے۔ فرانسیسی زبان انھوں نے تین مہینے میں استاد کی مدد کے بغیر اتنی سیکھ لی کہ پڑھنے اور ترجمہ کرنے کے قابل ہو گئے مطالعہ میں ان کا شغف حد درجہ تک پہنچا ہوا تھا خصوصاً عربی اور فارسی تصانیف تو ان کی ہر وقت کی مونس و ہمدم تھیں۔ انھوں نے شادی عمر بھر نہ کی اور تمام عمر تجرد میں گزار دی۔

سید صاحب کی صورت و سیرت کی تصویر ان بلیغ لفظوں میں کھینچنے کے بعد جرجی زیدان ان کی پولٹیکل تمناؤں کو یوں ظاہر کرتا ہے:- سید جمال الدین کی زندگی کا نصب العین اور وہ مرکزی نقطہ جس کے گرد ان کی امیدوں اور عمر بھر کی کوششوں کی پرکار گھومتی رہی اتحادِ اسلام اور ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت کا قیام تھا۔ جو ایک خلیفۃ المسلمین کے ماتحت ہو۔ اس کوشش میں انھوں نے اپنی تمام طاقتیں صرف کر دیں۔ دنیا کو چھوڑ دیا۔ شادی نہ کی اور کسب معاش کے لئے کوئی پیشہ نہ اختیار کیا۔ بایں ہمہ وہ اپنی کوشش میں ناکام رہے اور اپنے خیالات اور آرزوؤں کی کوئی تحریری یادگار بجز اس کتاب کے جو انھوں نے ملاحدہ کے رد میں لکھی ہے اور چند مختلف الموضوع رسالہ جات اور مضامین کے نہیں چھوڑی۔ لیکن اس میں

شک نہیں کہ انھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کے دلوں میں خیالات کی ایک نئی رو دوڑا دی جس نے ان کے قلم میں روانی اور ان کے دماغ میں جولانی پیدا کر دی۔ اس سے مشرق کچھ فائدہ تو اٹھا چکا ہے اور کچھ اٹھائے گا۔

سید صاحب کی حیرت انگیز شخصیت میں جو مقناطیسی بلکہ برقی اثر مضمر تھا۔ اس کا ادنیٰ تصور اس واقعہ سے ذہن میں آسکتا ہے کہ باوجودیکہ وہ ایک سنی المذہب عالم تھے اور اس لحاظ سے ایران میں جو شیعیت کا گھر ہے اُن کا کوئی اثر نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے نہ صرف یہ کہ ایران کے عامۂ مسلمین کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا اور اُن میں اُن خیالات کی روح پھونک دی جنھوں نے چند ہی دنوں میں استبداد و شخصیت کا طبقہ الٹ دیا۔ بلکہ علمائے کرام و مجتہدین عظام کو اتحاد بین المسلمین کی اصولی ضرورت سے آگاہ کر کے اپنا اس حد تک ہمخیال بنا لیا کہ جب ناصرالدین شاہ نے انگریزی کمپنی کو تمباکو کا اجارہ دے دیا تو سید جمال الدین کے ایک خط سے متاثر ہو کر مجتہد اعظم حاجی میرزا حسن شیرازی نے اس مضمون کا فتویٰ جاری کر دیا کہ تاوقتیکہ اجارہ منسوخ نہ کر دیا جائے اہل ایران پر تمباکو پینا حرام ہے! المنار کے اڈیٹر سید محمد رشید لکھتے ہیں کہ اس خط نے جناب مجتہد اعظم کو جن کا روحانی اثر اہل ایران کے دل پر مستولی ہے! ایثار نفس اور قومی جوش کی تصویر بنا دیا۔ چنانچہ آپ نے استعمال و کاشت تمباکو کی حرمت کے متعلق فتویٰ جاری فرما دیا۔ اور تمام علمائے ایران نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس فتوے کو بجلی کی سرعت کے ساتھ نافذ کر دیا۔ لوگوں نے بھی اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ چنانچہ جس شام کو فتوے کی اشاعت طہران میں ہوئی اس کی دوسری صبح کو شاہ نے قلیان مانگا تو اسے یہ جواب ملا کہ محل میں تمباکو کی ایک پتی بھی موجود نہیں۔ سب جلا ڈالا گیا۔ شاہ نے فرطِ استعجاب سے وجہ دریافت کی تو خدام نے کہا کہ حضرت حجتِ اسلام حاجی مرزا حسن شیرازی مجتہدِ اعظم نے اس کے استعمال کے خلاف

فتویٰ جاری فرما دیا ہے۔ شاہ نے جب پوچھا کہ پہلے میری اجازت اس بارے میں کیوں نہیں لی گئی۔ تو انھوں نے کہا کہ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اس میں اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد شاہ کو طوعاً و کرہاً اجارہ منسوخ کرنا پڑا اور انگریزی کمپنی کو پانچ لاکھ پاؤنڈ بطور تاوان دینے پڑے۔

پروفیسر براؤن سید جمال الدین کی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دنیائے اسلام کے واقعات پر بیس سال تک جو اثر یہ عجیب و غریب شخص ڈالتا رہا۔ اس کے لحاظ سے غالباً اس کا کوئی اسلامی معاصر اس کی برابری نہیں کر سکتا اس کی مکمل سوانح عمری کے لکھے جانے کے یہ معنی ہوں گے کہ مسئلہ مشرقیہ کی زمانہ حال کی پوری تاریخ قلمبند کی جائے جس میں افغانستان اور ہندوستان کے تبصرے کے علاوہ ٹرکی مصر و ایران کے حالات پر نظر انتقاد ڈالی جائے۔ جہاں اس کا اثر ابھی تک مختلف صورتوں میں بمنزلہ ایک زندہ طاقت کے ہے۔

پروفیسر براؤن کی استشراقی قابلیت مسلم الثبوت ہے! ایران کے لٹریچر اور پالٹیکس میں جو دستگاہ انھیں حاصل ہے۔ وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے مصر اور ٹرکی معاملات پر بھی وہ اچھی طرح رائے زنی کرنے کے اہل ہیں۔ اور اس لحاظ سے ان کا یہ دعویٰ کہ مصر، ٹرکی اور ایران میں سید جمال الدین کی قائم کی ہوئی تحریک زندہ صورت میں موجود ہے۔ ہر طرح سے قابل تسلیم ہے لیکن مقام تعجب ہے کہ باوجود اُن آسانیوں کے جو ایک ہمہ گیر پریس نے حصول معلومات کے متعلق آجکل بہم پہنچا رکھی ہیں۔ پروفیسر ممدوح ہندوستان کے حالات سے یہاں تک بے خبر ہیں کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کی بیداری کو بھی بلحاظ اس بیداری کی خاص نوعیت کے سید جمال الدین کی تحریک سے منسوب کرتے ہیں۔ انتزاع دولتِ مغلیہ کے بعد دولت و اقبال اور علم و فضل کا مسلمانانِ ہند کو جواب دے جانا! افلاس و جہالت اور ذلت و ادبار کی تیرہ و تار گھٹاؤں کا

چاروں طرف سے امنڈ امنڈ کر ان کو چھالینا۔ ان کے امرا کی وارستہ مزاجی۔ ان کے علما کی بے راہ روی۔ ان کے خواص کی بے بصری۔ ان کے عوام کی بے خبری کا اغیار و اجانب کے نزدیک ناقابل اصلاح ٹھیرنا۔ اس یاس آفرین حالت میں یکایک رحمت حق کو حرکت ہونا اور اس رحمت کا حضور رحمت للعالمین کی آلِ اطہر کے ایک برگزیدہ فرد یعنی سید احمد خاں کی شکل میں ظاہر ہونا۔ سید احمد خاں کا اپنے آنسوؤں سے اپنی قوم کے اس باغ کو جس میں سات کروڑ خزاں رسیدہ پودے پڑے ٹھٹھر رہے تھے سینچنا اس کی آبیاری سے باغ میں پھر بہار آنا۔ جہالت و اوہام پرستی کے دل بادل کا چھٹنا۔ اس متعصبانہ مغائرت کا جو عیسائی حاکموں اور مسلمان محکوموں کے درمیان چلی آتی تھی گھٹنا۔ مسلمانوں کا اس سچے یقین کے ساتھ کہ ہندوستان کی حدود کے اندر انھیں اپنے پولیٹیکل تفوق کے احیا کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزوں کے ساتھ اتحاد و یک جہتی کے عقیدت مندانہ تعلقات قائم کر لینا۔ ان تعلقات کے استحکام میں انگریزوں کے اس طرز عمل کا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو انتظام حکومت میں خاص خاص مراعات کے ساتھ شریک کر لیا ہے۔ حصہ لینا۔ اور اس طور پر دنیائے اسلام کے ہندوستانی خطہ میں بجائے اس کے کہ مسلمان اپنے سیاسی کھنڈروں پر ایک خالص اسلامی محل از سر نو تعمیر کرنا چاہیں۔ ان کا ایک اینگلو مسلم محل کی تعمیر میں مصروف ہو جانا۔ کیا یہ تمام واقعات پروفیسر براؤن تک نہیں پہنچے اور کیا یہ سید جمال الدین کی شخصیت کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جس شخص نے جگایا انھیں حضیض مذلت سے نکال کر اوج عزت پر جس شخص کی مساعی جمیلہ نے پہنچایا۔ وہ سید احمد خاں ہے۔ جو اپنی زبردست شخصیت اور حیرت انگیز قابلیت دل و دماغ کے لحاظ سے کسی طرح سید جمال الدین سے کم نہیں سمجھا جا سکتا۔ بلکہ کئی ایک اعتبار سے اس پر بھی فوقیت رکھتا ہے

بہرحال ہندوستان سے اگر ہم قطع نظر کریں تو اس میں ذرا شک نہیں کہ
کہ اسلامی دنیا کا باقی اکثر حصہ سید جمال الدین کی ان کوششوں کا رہین منت ہے
جنھوں نے جمود و غفلت کے طلسم کو توڑ کر موجودہ زمانے کی ضروریات کے لحاظ
سے مسلمانوں میں بیداری کی ایک نئی روح پھونک دی اور پروفیسر براؤن نے ذیل
کے بلیغ الفاظ میں جو رائے سید صاحب کی نسبت ظاہر کی ہے وہ حقیقت کی تصویر ہے
مبدا رفیاض نے اس شخص کے دل و دماغ میں حیرت انگیز قابلیتیں ودیعت
کی تھیں۔ اُس کی ساری عمر خانہ بدوشی میں گزری۔ اور بجز فصاحتِ تقریر و بلاغتِ
تحریر کے جس میں تبحر علمی اور وسعت معلومات دینی و دنیوی نے اسلامی درد کے
ساتھ مل کر ایک اعجاز آفرین کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے پاس کوئی طاقت نہ تھی
لیکن اسی طاقت کا یہ اثر تھا کہ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے لرزتے تھے۔
اُن قوتوں کو حرکت میں لاکر جو اس کے ایک اشارہ پر چلتی تھیں اور جن پر یورپ اور
ایشیا کے ارباب تدبیر قابو نہ پا سکے۔ اس نے فن سیاست کے ماہروں کے بڑے بڑے
منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ مصری وطن پرستوں کی تحریک اسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔
اور اگرچہ ۱۸۸۲ء میں اس تحریک کے علمبرداروں کو شکست ہوئی لیکن

اب بھی اس راکھ میں تھوڑے سے شرر ہیں پنہاں

ایران کی دستوری تحریک کا بانی مبانی بھی اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے اُس
نے دول اسلامی کو اُن خطرات سے آگاہ کیا جو قضائے مبرم کی طرح ان کے سر پر
سوار ہیں اور ان کو بتا دیا کہ دول یورپ کی مسلسل اور غاصبانہ دست اندازیوں کا
توڑ کرنے کے لئے ان میں باہمی اتحاد کا ہونا لازمی ہے مسلمانوں کی چند خود مختار
حکومتیں یعنی ٹرکی ایران اور مراکو جو دستبردِ روزگار سے اب تک بچی ہوئی ہیں دول یورپ
کی انفرادی یا اجتماعی دراندازیوں سے خطرے میں ہیں اور یہ خطرہ اغلب بتدریج اُس

اتحاد پر مجبور کر رہا ہے جسے پان اسلامزم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سچ پوچھا جائے تو پان اسلامزم کا خیال سید جمال الدین ہی کا پیدا کیا ہوا ہے! اگر کوئی اسلامی فرمانروا اس شخص کو ایسا ہاتھ آجاتا جو اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کا پورا پورا احساس کرتا اور جوشِ اسلامی و مودت قومی کے جذبات سے اس حد تک متاثر ہوتا کہ ان آرزوؤں کو قوت سے فعل میں لا سکتا تو سید جمال الدین بہت بڑا کام کر گیا ہوتا۔ ناصر الدین شاہ نے جو خود غرضی استبداد اور مطلق العنانی کا جیتا جاگتا مرقع تھا کچھ دن کے تجربہ میں اسے مایوس کر دیا۔ البتہ سلطان عبدالحمید خاں کی ذات کے ساتھ اس کی بہت امیدیں وابستہ تھیں۔ چنانچہ اس نے عملی طور پر ایک نئی تحریک کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھوں سے رکھا جو ابھی تک بہت سے ذی اثر ایرانیوں کی مطمح نظر ہے۔ اس تحریک کا منشا یہ ہے کہ ترکی سنیوں اور ایرانی شیعوں میں اس سمجھوتے کے ساتھ باہمی اتحاد قائم ہو جائے کہ ایرانی سلطان ٹرکی کو خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیں اور ترک شاہ ایران کو شیعوں کا مقتدا مان لیں اور دونوں فریق ان خاص خاص دل آزار باتوں کو چھوڑ دیں جنھوں نے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کو ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہے۔

سید جمال الدین پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا تھی کہ دونوں سلطنتوں کو ایک ہی قسم کے خطرات کا سامنا ہے اور ان کی خیر اسی میں ہے کہ بجائے ایک دوسرے پر زہر اگلنے اور باہم دست و گریبان ہونے کے وہ اپنی متحدہ طاقت کو اس حریف کے خلاف عمل میں لائیں جو دونوں کا یکساں دشمن ہے۔ اس حقیقت کا ادراک اگر سنی و شیعی دنیا نے کر لیا تو کوئی دن جاتا ہے کہ دنیا سید جمال الدین کی عمر بھر کی محنت کو ٹھکانے لگا ہوا دیکھے گی۔

از محمد اسمٰعیل گودھروی

بطلِ حرّیت

وطن سید صاحب افغانستان میں پیدا ہوئے۔ گو بعض نے نواحِ فارس مقام "ہمدان" آپ کی پیدائش بیان کی ہے، لیکن صحیح ترین قول یہی ہے کہ سید صاحب کی جائے پیدائش ملک افغانستان کے علاقہ کنز میں ایک قریہ "اسعد آباد" ہے۔ یہی قریہ سید صاحب کی پیدائش کا مقام ہے۔ جو کابل سے پا پیادہ تقریباً تین دن کی مسافت پر واقع ہے۔

پیدائش سید صاحب ۱۲۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام "سید صفدر" تھا۔ آپ کا خاندان علاقہ افغانستان میں ایک نہایت مشہور و معروف خاندان تھا اہل افغانستان خاص طور پر اس خاندان کا احترام کیا کرتے تھے۔ اس خاندان کو کسی زمانے میں بڑا عروج حاصل تھا، یہاں تک کہ افغانستان کا بہت بڑا علاقہ ان کی مملکت میں تھا۔ اور وہاں ان کی امارت و حکومت تھی۔ لیکن بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر والی افغانستان امیر "دوست محمد خاں" نے سید صاحب کے والد سید صفدر صاحب کو کابل طلب کیا۔ اور وہیں قیام کے لئے مجبور کیا۔ چنانچہ سید صفدر صاحب اس ہونہار بچے (سید جمال الدین) سمیت کابل پہنچے۔ اور وہیں قیام کر کے زندگی کے دن گزارنے لگے۔

سید صاحب کی تعلیم اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ سید صاحب کی پیدائش ۱۲۵۴ھ میں ہوئی، آپ اپنے والد کے پیارے اور ہونہار بیٹے تھے۔ آٹھ سال کی عمر ہوئی تو سید صاحب کے والد کو اپنے اس ہونہار لڑکے کی تعلیم کا حد سے زیادہ خیال ہوا۔ اور ان کو تعلیم دلانے کی طرف توجہ کی۔ سید جمال الدین صاحب نے آٹھ سال کی عمر میں تحصیل علم کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ بے انتہا زکی تھے۔ جس علم میں قدم رکھتے، تیز گام ہو جاتے۔ چنانچہ اٹھارہ سال کی عمر تک صرف، نحو، معانی، بیان، تاریخ عام و خاص، تاریخ قدیم و جدید، علوم شرعیہ، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، عقائد و کلام، علوم منطقیہ حکمیہ، علوم طبعیہ الٰہیہ، علوم ریاضیہ، حساب و ہندسہ، علم ہیئت تشریح، علم طب و تشریح وغیرہ کی تکمیل کر لی۔ اور ہر فن میں کامل ہو کر علمائے کبار کی فہرست میں شمار ہونے لگے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک فاضل متبحر بن کر اپنے ہمعصروں سے آگے نکل گئے۔ آپ تحصیل علم سے فراغت حاصل کر کے بعض وجوہ کی بنا پر سیاحت ہند کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے۔ تقریباً ایک سال تک سرزمین ہند میں قیام رہا۔ اس دوران میں آپ یورپ کے علوم جدیدہ بالخصوص علوم ریاضیہ کا نہایت دقتِ نظری کے ساتھ مطالعہ کرتے رہے۔

سفر حج سید صاحب کی عمر اس وقت انیس سال کی تھی، ایک سال اور چند ماہ قیام ہند کے بعد ۱۲۷۲ھ میں ادائے فریضۂ حج کی تیاری کا عزم بالجزم کر لیا۔ سیر سیاحت کا بے حد شوق تھا، پا پیادہ روانہ ہو گئے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے تقریباً ایک سال کے بعد ۱۲۷۳ھ میں سرزمین حجاز میں قدم رکھا اور مکۂ معظمہ پہنچ گئے۔

اس سفر میں آپ نے نہایت مفید معلومات حاصل کیں؛ جس قوم اور ملک میں سے گزرتے، اُن کے عادات، اخلاق، غفلت و بیداری، ارتقاء و تنزل کے اسباب

معلوم کرلیتے، غرض کہ ہر طرح سے اُن کی حقیقت معلوم کرتے، اُن کے نقائص دُور کرنے کے لئے اصلاحی تجاویز سوچتے! اگرچہ اس طرح ملکوں اور قوموں کی بہبودی کے لئے باتیں معلوم کرنا ازحد مشکل ہے۔ لیکن سید صاحب پر ہر مشکل میں عمل و کار کی راہیں کھل جاتیں، طریق عمل میں بے شمار سہولتیں پیدا ہوجاتیں۔ آپ کو ان تجربات کی واقعی سخت ضرورت تھی، کیونکہ آپ اصلاحِ امتِ اسلام کا عَلَم قائم کرنے والے تھے۔

قیامِ مکّہ معظّمہ حج کی بجاآوری کے لئے موسمِ حج میں حجازی، آفاقی، عربی، عجمی اور دیگر ہر ملک کے مقتدر اربابِ بصیرت کا بہت بڑا مجمع ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کو علماً فضلا، اور عوام سے ملنے کا اتفاق ہوا، ہر ملک اور ہر قوم کے مختلف خیالات کے لوگوں سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ اسی دوران میں آپ کو دُنیائے اسلام کے تازہ ترین حالات معلوم کرنے کا ایک اچھا موقع مل گیا۔

ملازمتِ افغانستان فریضۂ حج کی بجاآوری کے بعد سید صاحب اپنے وطن واپس تشریف لے گئے اور افغانستان کی سیاسیات کے منصب جلیلہ پر متعین ہو گئے، امیر دوست محمد خان انھیں نہایت عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ متعدد سیاسی محکمے آپ کے سپرد تھے۔ مگر یہ حالت دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ بعض سیاسی مصالح کی بناء پر سید صاحب کو افغانستان چھوڑنا پڑا۔

حکومتِ ہند چنانچہ سید صاحب حکومت افغانستان سے حج کی اجازت طلب کر کے ۱۲۸۵ھ میں دوبارہ ہندوستان تشریف لائے۔ حکومت برطانیہ نے سیاسی مصلحتوں کی بناء پر سید صاحب کی کچھ خاطر و مدارات کی لیکن ابھی ایک ماہ گزرنے نہ پایا کہ حکومتِ ہند نے ایک سرکاری جہاز میں سوار کر کے سید صاحب کو سویز لے جا اتارا۔ سویز سے آپ مصر چلے گئے اور تقریباً چالیس یوم مصر میں قیام فرمایا۔

قیامِ مصر اسی اثنا میں آپ جامع ازہر میں اکثر جایا کرتے تھے اور طالب العلم آپ کی

صحبت اور تبحر علمی سے فیض حاصل کرتے۔ چند طلبا آپ کے مکان پر بھی حاضر ہوتے اور باقاعدہ "شرح اظہار" کا درس حاصل کرتے۔ لیکن سید صاحب کا ارادہ زیادہ قیام کا نہ تھا۔ حج کے ارادے سے ملک سے نکلے تھے، لیکن سر دست انھیں حج کا ارادہ فسق کرکے آستانہ کا سفر اختیار کرنا پڑا۔

سفر آستانہ: یہ دور سلطان عبدالعزیز خاں کا تھا۔ اس وقت صدر اعظم کے عہدہ پر عالی پاشا "فائز تھے۔ انھوں نے سید صاحب کا نہایت احترام و اعزاز کیا۔ قیام گاہ کے لئے نہایت عمدہ مکان دیا۔ ہر طرح سے آسائش کی صورتیں بہم پہنچائیں۔ آپ کی تبحر علمی اور سیاسی دماغ نے ارباب حکومت کے قلوب میں خاص جگہ حاصل کرلی اور تقریباً چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ سید صاحب مجلس معارف کے ایک رکن رکین بن گئے، بہت سی جدید اصلاحیں پیش کیں، ارکان حکومت میں بے انتہا جمود تھا اس لئے سید صاحب کی اکثر تجاویز اور اصلاحی مشورے بیکار ہو جاتے کیونکہ جہاں خواب و جمود کی گرم بازاری ہو، وہاں بیداری و آزادی اور حریت رائے کی قیمت کہاں؟ اکثر اوقات سید صاحب کے مصاحبین اور دوست احباب ہی سید صاحب کے مخالف رہے۔ اور اُن کی وجہ سے اکثر امور میں آپ کی مجوزہ تجاویز ناکام رہ جاتیں آپ اکثر جامع ایا صوفیا اور جامع سلطان احمد میں درس اور لکچر دیا کرتے تھے حکومت کی طرف سے سید صاحب کی اس قدر عزت افزائی نے بعض ارباب بست و کشاد کو حسد کی آگ نے بھڑکا دیا۔ انھوں نے آپ کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔

آپ کے مخالفین میں سب سے زیادہ حصہ حسن فہمی آفندی نے لیا جو آپ پر بے حد ناراض تھے۔ وجہ مخالفت یہ تھی کہ مجلس معارف میں جس جگہ پر سید صاحب کا تقرر ہوا تھا، اُس جگہ پر یہ کام کرتے تھے، اور آپ کی آمد سے یہ جگہ ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور سید صاحب اس پر مامور ہو گئے تھے۔ حسن فہمی کی شر انگیزیاں کامیاب ہو گئیں

اور سید صاحب پر کفر و زندیقیت کا فتویٰ دیا کہ نبوت اور حکمت کو ایک کر دیا۔ خاص خاص لوگ آپ کے مخالف ہو گئے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ صدر اعظم علی پاشا آپ کا بے حد احترام کرتا تھا، مخالفتِ فتنہ کی اہمیت سے اُس نے سید صاحب کو متنبہ کیا اور ترکِ قسطنطنیہ کا مشورہ پیش کیا۔ حضرت کے بعض رفقاء نے مصر جانے کی رائے دی، آپ کو یہ رائے پسند آئی اور اوائلِ محرم ۱۲۸۸ھ میں مصر پہنچ گئے۔

مصر کا اصلاحی کام اس مرتبہ بھی سید صاحب کا خیال مصر میں مستقل قیام کا نہ تھا بلکہ پہلی مرتبہ کے سفر میں مصر کے مناظر و مظاہر، مصر کی رعنائیاں اور دلفریبیاں دیکھ چکے تھے اور اس لئے محض تفریح کے خیال سے مصر تشریف لے گئے۔ لیکن جب عمائدِ مصر سے ملاقاتیں ہوئیں، ریاض پاشا نے سید صاحب کی حد سے زیادہ خاطر و مدارات اور اعزاز و احترام کیا اور حد سے زیادہ محبت و گرویدگی اور لطف و مہربانی سے پیش آئے، تو سید صاحب نے قیامِ مصر کا ارادہ کر لیا اور مصر میں مقیم ہو گئے قیام کے بعد حکومتِ مصر کی جانب سے ایک ہزار قرش، اور دوسری روایت کے بموجب ۱۲ سو قرش ماہوار سید صاحب کا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔ یہ وظیفہ کسی خدمت کے معاوضے اور صلے میں نہ تھا۔ بلکہ بلا خدمت مقرر ہوا تھا، اُس وقت مصر کے علماء و طلباء میں سید صاحب کے تبحرِ علمی کی دھوم مچ گئی، اکثر علماء و طلباء آپ کی ملاقات کے لئے آتے اور سید صاحب کے کلام و درس سے مستفید ہوتے تشنگانِ علم کے الحاح و اصرار پر سید صاحب نے متعدد علوم و فنون میں علوم و فنون میں طلباء کو سبق شروع کرا دیئے۔ خاص کر علمِ کلام، علم حکمت نظریہ، حکمتِ طبعیہ عقلیہ، علم ہیئت و تصریح، علمِ تصوّف، علم اصولِ فقہ وغیرہ میں ید طولیٰ حاصل تھا، سید صاحب کسی مدرسے میں نہ جایا کرتے، بلکہ اپنا مکان ہی آپ کا مدرسہ تھا۔ طلباء مکان پر آ کر درس و تحصیل علم کرتے۔ سید صاحب کبھی کبھی جمعہ کے دن مدرسۂ جامع ازہر میں بھی

جایا آیا کرتے لیکن نہ اس لئے کہ وہاں جا کر درس وتدریس کا کام کرتے۔ بلکہ محض دیکھنے اور تفریح کے لئے جاتے تھے۔

غرض آپ نے مصر میں ایک نئی روح پھونک دی، سیاسی بیداری پیدا ہو گئی آپ ادبی وسیاسی مضامین ورسائل بھی لکھا کرتے تھے۔ اس طرح نہ صرف مصر بلکہ مشرق قریب بھی ان کے اثرات سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہر طرف علم کا شہرہ ہوا۔ سینکڑوں مضمون نگار بن گئے، ہزاروں قلم کے مالک ہو گئے۔ اور اگر سچ پوچھا جائے تو آج بھی جو مصر میں بیداری ہے وہ سید صاحب ہی کے شجرۂ طیبہ کے ثمرات و برکات ہیں۔

تلامذہ سید صاحب کی صحبت سے بے شمار اشخاص نے علمی فوائد حاصل کیئے۔ اور بے شمار افراد آپ کے فیضِ صحبت سے مستفیض ہوئے ہیں، لیکن یہ چند ہستیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: شیخ مفتی محمد عبدہٗ مصری، جو دورِ حاضرہ کے امام مانے جاتے ہیں جن کے اقوال اصلاحیہ وحکمیہ آج بطور استدلال پیش کئے جاتے ہیں۔ سید صاحب ہی کے خوشہ چیں ہیں۔ شیخ فاضل عبدالکریم سلمان، سعد زاغلول پاشا، ابراہیم آفندی اللقانی، سید وفا قونی۔ اور اس قسم کے بہت سے بڑے بڑے لوگ سید صاحب کے شاگرد ہیں۔ مصر کے علاوہ دور دراز ملکوں سے لوگ علم حاصل کرنے کے لئے آتے، چنانچہ علامہ ادیب اسحاق شامی، علامہ سلیم نقاش شامی، علامہ سعد بستانی وغیرہم جیسی خاص خاص ہستیاں بھی سید صاحب ہی کی شاگرد ہیں۔ آج مصر میں جو لوگ خدماتِ ملّی انجام دے رہے ہیں اور جن کے علوم کی بڑی شہرت ہے مثلاً سید رشید رضا مدیر مجلّہ المنار، امیر شکیب ارسلان، فاضل محمد ابو زید، محمد رضا وغیرہم بالواسطہ سید صاحب ہی کے تلامذہ ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ شیخ مفتی محمد عبدہٗ کے چشمۂ علم سے فیضیاب ہوئے تھے! ور شیخ مفتی محمد عبدہ سید صاحب کے

ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ سید صاحب کے تلامذہ میں بڑی بات یہ تھی کہ جو کچھ حاصل کیا، اور سید صاحب کے درس سے اخذ کیا، تحریر و تقریر، درس، تلقین کے ذریعہ عام کر دیا۔

اوّلین قائدِ شرق سید صاحب کا اسلوبِ تحریر و تقریر، درس و تلقین کا بالکل جُداگانہ تھا، سرزمین مصر کیا، تمام عالم اسلامی مدتوں سے اس اسلوب وطرق سے بالکل خالی تھا۔ سید صاحب کے اس جدید اسلوبِ تحریر و درس نے طلبہ کے اندر وہ روح اور جذبۂ عمل پیدا کر دیا کہ ہر شخص نشۂ حرّیت و آزادی، نشۂ اعلاءِ حق سے مخمور ہو گیا، اور جذبۂ روحانی ان کو ہر میدان میں اعلائے کلمۃ اللہ اور حق گوئی کے لئے مجبور کرتا، اس لئے نہایت حریت و آزادی کے ساتھ ما فی الضمیر کی تبلیغ کرتے دنیا کی کوئی زبردست سے زبردست طاقت بھی ان کو اس سے باز نہ رکھ سکتی۔ آج مشرق میں جو حرّیت و آزادی اور سیاسی بیداری موجود ہے وہ درحقیقت سید صاحب ہی کی تعلیم و تلقین کی روح ہے۔ مصر اور شرق قریب میں عام بیداری اور تحریکاتِ سیاسیہ کا وجود جو نظر آ رہا ہے، ان کا اولین محرک بلاواسطہ یا بالواسطہ سید صاحب ہی کا وجود ہے۔ تحریکِ خلافت کا آغاز بھی آپ ہی کی تلقین کا ثمرہ ہے۔ بغرض سید صاحب آخری دور کے امام ہیں۔ مشرق کی بیداری کے اولین قائد و راہنما ہیں اور مشرق پر ان کا بڑا احسان ہے وَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔

مصر کی حالت مصر کے اصلی باشندے اکثر زراعت پیشہ رہے، قناعت پسندی ان کا شیوہ تھا، اور اس لئے ان میں حکومت و ملوکیت کی روح مفقود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مصر پر بیرونی فاتحین نے حملے کئے، غالب آئے اور مصر کے اصلی باشندوں کو غلام بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں وہی ملک و قوم زندہ رہ سکتی ہے جو اپنی طاقت اور قوتِ بازو سے اپنی حرّیت و آزادی کو بچائے۔ جو قوم یا ملک اس سے غفلت کر کے

دیگر ذرائع زندگی میں منہمک ہوجائے تو وہ دنیا میں اسی لئے ہے کہ اغیار واجانب کا غلام بن کر رہے اور بس! یہی وجہ ہے کہ مصر کے اصلی باشندے عام طور پر زراعت پیشہ تھے، اور اسی پر قناعت کرلی تو ہمیشہ اغیار واجانب کی حکومت و غلامی میں انھیں زندگی کاٹنی پڑی اور ہمیشہ ان پر غیروں کا تسلط رہا۔ فراعنہ مصر سے لے کر اس وقت تک بیرونی فاتحین کی حکمرانی رہی ہے۔ گو کبھی کبھی اہل مصر میں آزادی کی تحریک پیدا ہوئی، لیکن کسی نہ کسی بیرونی طاقت نے ان کو ٹھنڈا کردیا۔

البتہ مصر میں بعض آزاد قومیں بھی آباد ہوئیں مثلاً عرب، کرد، چرسی، البانی، ترک وغیرہ جن میں حرّیت و آزادی اور خودداری و خود مختاری کی روح موجود رہی اور وہ قومیں درحقیقت آخری فاتحین کی اولاد ہیں۔ مصر میں نصرانی قومیں بھی آباد ہیں، لیکن ان میں بھی روحِ حرّیت مفقود ہے۔ البتہ یہ قومیں بیرونی عیسائی طاقتوں کو مصر پر تسلّط دلانے میں مدد پہنچاتی رہتی ہیں۔

مصر میں اکثر مختلف المذاہب، مختلف العقائد، مختلف التہذیب لوگ بستے ہیں، اور اس لئے مصر اکثر اغیار واجانب کی غلامی میں رہا۔ اور انھیں وجوہات کی بنا پر مصر پر یورپ کی نگاہیں پڑیں اور مشرق کو غلام بنایا۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں نپولین کی فتح نے یورپ کا اثر قبول کیا، اور جبکہ مصر سے فرانس کا تسلط اٹھا محمد علی البانی نے یہ محسوس کیا کہ یورپ بمقابلۂ دیگر اقوام میدانِ ارتقاء میں آگے ہے، اور اس لئے ان سے طرقِ اصلاحیہ اور سیاسیہ اخذ کر کے مصر کو ترقی کرنی چاہئے اور خود مختار و آزاد رہ کر مصر کو زندہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس نے یورپ کے طریقہائے سیاسیہ سے اخذ و استنباط اور اقتباس کر کے مصر کے حالات پر منطبق کر کے مصر کی اصلاح شروع کردی۔ اگرچہ محمدؐ علی کی یہ تحریک عارضی تحریک تھی لیکن اس نے مصر کے اندر ایک سیاسی بیداری ضرور پیدا کردی اور مصر نے اپنی رفتار ترقی میں یورپ کو

اپنا سیاسی مشیر بنا کر ترقی کرنا شروع کر دیا۔ اُس وقت خدیو اسمٰعیل پاشا نے مصر کو تباہ و برباد کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ اسمٰعیل پاشا فطرتاً عیاش طبع اور مسرف واقع ہوا تھا، اس لئے مصر کے خزانے میں کوئی چیز باقی نہ چھوڑی۔ یورپ سے بے شمار روپیہ قرض لیا اور عیش پرستیوں میں اڑا دیا۔ اس طرح اسمٰعیل پاشا نے مصر کو یورپ کے قرضے سے دبا دیا، اور یورپ کو مصر پر مسلط کرنے کے سامان بہم پہنچا دیئے۔ فطرتاً اسمٰعیل پاشا مغرور، صاحب نخوت تھا۔ طبیعت عیش پسند تھی، اس لئے یورپ کی دلفریبیوں پر جان دیتا تھا، نفع و ضرر، اچھے، برُے کی اسے تمیز نہ تھی۔ اس لئے اپنے پاس بیشمار انگریزوں کو جمع کر لیا تھا، اور ہمہ اوقات ان میں زندگی کاٹتا تھا۔ جب اہلِ مصر نے دیکھا کہ خدیو اسمٰعیل پاشا کی حرکتوں اور عیش پرستیوں نے مصر کو قرض کے بوجھ سے دبا دیا ہے، اور مصر کو برطانیہ کے ہاتھ گروی رکھ دیا ہے، انگریزوں کے حلقہ میں شب و روز گزارتا ہے، اُن کی ظاہری دلفریبیوں کے جال میں پھنس کر ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔ اور مصر کے مستقبل کو تاریک بنا رہا ہے۔ تو مصریوں میں اسمٰعیل پاشا کے خلاف جوش پھیل گیا، اور تمام قوم اسمٰعیل پاشا کے خلاف کھڑی ہو گئی اور ارادہ کر لیا کہ خدیو اسمٰعیل پاشا کو خدیویت سے برطرف کر دیا جائے، حتیٰ کہ بولشویکیوں اور انگریزوں کی جماعت جو خدیو اسمٰعیل کی کوتاہیوں کی وجہ سے مصر میں قیام پذیر تھی، اُس کو بھی مصر سے خارج کر دیا جائے۔ چنانچہ مصریوں میں یہ حرکت وطنی پیدا ہوئی۔ جابجا اسمٰعیل پاشا کے خلاف تقریریں ہونے لگیں، اور ایک زبردست عملی کارروائی شروع ہو گئی۔ اور مصر کے گلی کوچوں میں "المصر للمصریین" (مصر مصریوں کا ہے) کے نعرے بلند ہونے لگے اور مصریوں کا یہ قومی نعرہ بن گیا۔

اسمٰعیل پاشا کی معزولی یہ زمانہ وہی سید جمال الدین کا زمانہ تھا۔ آپ نے

مصریوں کی سپہ سالاری اختیار کی اور مسئلہ خدیویت کو ہاتھ میں لیا، اور نہایت عزم و استقلال کے ساتھ اسمٰعیل پاشا کے خلاف کھڑے ہو گئے اور تحریر و تقریر کے ذریعے اہل مصر کو بیدار کیا، اور مستقبل قریب کے خطرات سے متنبہ کیا خواص و عوام کو اسمٰعیل پاشا کی مقاومت پر آمادہ کیا۔ اگرچہ خدیو اسمٰعیل پاشا کے پاس خدیویت کی طاقت تھی اور سید جمال الدین صاحب ایک فقیر اور مسافر تھے۔ تاہم سید صاحب کے پاس صرف حق و صداقت کی لازوال طاقت موجود تھی۔

مبیں حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم　　شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

آخر سید صاحب کی طاقتِ حق نے خدیو اسمٰعیل پاشا کی طاقت کو شکست دی، اسمٰعیل پاشا کی ساری طاقتیں سرنگوں ہو کر حق کے سامنے جھک گئیں اور اسے خدیویت سے معزول کر دیا گیا۔ صادق المصدوق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ہے "الحق یعلو ولا یعلیٰ" (حق غالب ہو کر رہتا ہے نہ مغلوب) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔" (یعنی حق آیا، باطل مٹا اور باطل تو مٹنے ہی کے لئے ہے) اور سچ ہے کہ باطل مٹنے ہی کے لئے ہے! اور حق غلبہ ہی کے لئے ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اربابِ حق بیدار رہوں، اور باطل کی مقاومت کے لئے انتہائی جدّوجہد اور سعی کریں۔

توفیق پاشا کی خدیویّت اس طرح اسمٰعیل پاشا کی علیحدگی کے بعد توفیق پاشا خدیویّت مصر کے مالک بنے۔ توفیق پاشا سید صاحب کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے، اور ہمیشہ سید صاحب سے کہا کرتے تھے کہ میری خدیویت درحقیقت آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا صلہ ہے اور میں اس بارے میں آپ کا شکر گزار ہوں اور ہمیشہ شکر گزار رہونگا۔

سید صاحب کا مصر سے اخراج سید صاحب کو خدیو توفیق پاشا سے خاص تقرب حاصل تھا اور خدیو توفیق پاشا سید صاحب کا بے انتہا احترام و اعزاز کرتا تھا۔ اور پھر آپ کی علمی و سیاسی قابلیت نے مصر کے اندر خاص عزت پیدا کر لی تھی، مگر حاسد طبقہ ان سے غافل نہ تھا۔ ان کو چین سے مصر میں بیٹھنے دینا نہ چاہتا تھا، بلکہ آتشِ حسد و رشک کی چنگاریوں سے سید صاحب کے مقامِ ارفع کو خاکستر بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے چاروں طرف سے دشمن مارِ آستین نکل کھڑے ہوئے اور توفیق پاشا کو سید صاحب کے خلاف رپورٹیں دینے لگے اور جو لوگ سید صاحب کے مصاحب و ہمنشین تھے وہی آپ کے دشمن بن گئے۔ توفیق پاشا کو ورغلانے کا آخری طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ سید جمال الدین صرف اسمٰعیل پاشا کی معزولی و برطرفی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی خدیویت سے برطرف کئے جائیں اور مصر میں جمہوریت قائم کی جائے۔ حاسدین نے جب توفیق پاشا کو یہ خبر پہنچائی تو توفیق پاشا آگ بگولا ہو گیا اور معاملہ پر کچھ غور نہ کیا اور سید صاحب کے مصر سے اخراج کا حکم صادر کر دیا۔ اور انھیں حراست میں لے کر سویز تک پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے آپ جہاز میں بیٹھ کر ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے اور ۱۲۹۶ھ میں سرزمین ہند پر رونق افروز ہوئے۔ حکومتِ ہند نے انھیں حیدر آباد پہنچایا اور وہاں نظر بند کر دیا۔

سید صاحب حیدر آباد میں نظر بند تھے کہ ادھر مصر میں عرابی پاشا کی شورش کا ظہور ہوا اور نہایت زور کے ساتھ یورپی اقوام کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی کہ مصر، مصریوں کے لئے ہے۔ بیرونی طاقتوں کو یہاں سے نکال دینا چاہئے۔ یہ تحریک نہایت زور کے ساتھ اٹھی اور بہت سے یورپین قتل بھی کر دیئے گئے، لیکن نظامِ قومی میں نقص ہونے کی وجہ سے تحریک ناکام رہی

شورش کو فرو کرنے کے لئے برطانیہ نے فوجی طاقت سے کام لیا اور عرابی پاشا کے ساتھیوں اور حامیوں کو قتل کرا دیا۔ اور برطانوی گورنر لارڈ کرد لہر نے نہایت چالاکی اور چالبازی سے اہل مصر کو کہا کہ برطانیہ کی صرف محکمہ مالیات پر حکمرانی رہے گی اور باقی اختیارات خدیو مصر کو ہوں گے۔ اس طرح سمجھا کر مصریوں کو ٹھنڈا کیا، لیکن بعد میں وہی طریق استعماریت اختیار کیا جو اہل یورپ کی عادت ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے اور اور دکھانے کے اور!

بہر کیف، عرابی پاشا کی تحریک کے زمانے میں سید صاحب کو گورنمنٹ ہند حیدر آباد سے منتقل کر کے کلکتہ لے گئی اور وہاں نظر بند کر دیا۔ اور پورے طور پر نگرانی کی۔ جب عرابی پاشا کی شورش فرو ہو گئی تو برطانیہ نے سید صاحب کو آزاد کر دیا اور اجازت دیدی کہ جہاں چاہیں، جائیں۔

سفر یورپ نظر بندی سے رہائی ہوئی تو آپ نے فوراً یورپ کا ارادہ فرمایا اور ۱۸۸۵ء میں یورپ کی طرف روانہ ہو گئے اور سیدھے لندن پہنچ گئے۔ لندن میں چند یوم مقیم رہ کر پیرس کی طرف چلے گئے۔ پیرس میں تقریباً تین سال سے کچھ زیادہ قیام فرمایا، اس دوران میں جمعیۃ عروۃ الوثقیٰ نے آپ پر ایک رسالہ کے اجراء کا بار ڈالا کہ جس کے ذریعے عالمِ اسلامی کی خدمت کی جائے اور وحدتِ اسلامیہ کی دعوت دی جائے اور کرۂ ارضی کے مسلمانوں کو ایک مرکز خلافت پر جمع کیا جائے۔ چنانچہ سید صاحب نے "عُروۃ الوثقیٰ" کے نام سے عربی میں ایک رسالہ جاری کر دیا۔ رسالہ کا اسلوب انداز تحریر نہایت مؤثر تھا۔ تحریر میں وہ زور کہ مردہ روحیں بھی جوش و حمیت سے حرکت میں آجاتی تھیں اور اپنی حریت کا احساس کرنے لگ جاتیں۔ رسالہ میں وحدتِ اسلامیہ، مشرقی اور انگریزی سیاست مسئلۂ مصر، سیاستِ برطانیہ اور ہند، سیاستِ برطانیہ اور مصر، دولتِ عثمانیہ اور

یورپ، انگریز اور اسلام، سواحل بحر احمر اور انگریز، برطانیہ اور سوڈان کے عنوانات سے جو مضامین سید صاحب نے سپرد قلم کئے تھے، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب کو سیاست میں کس قدر دسترس تھی۔ یورپ کی سیاسی چالوں کو کس طرح سمجھتے تھے اور مسلمانوں کی غفلت پر کس قدر افسوس کرتے تھے۔ عروۃ الوثقیٰ کے اجرا نے برطانیہ اور فرانس کی چالوں کا پردہ فاش کر دیا، مشرق اور عالم اسلام کو بیدار و متحد ہونے کی دعوت دی، یہ بتایا کہ اپنی خودداری محفوظ کر لیں، مرکز واحد پر جمع ہو جائیں کہ اس طرح اسلاف کی عظمت پھر حاصل کریں۔

اس سے مسلمانوں کے اندر ایک بیداری کی روح پیدا ہو گئی اور یورپ کی حکومتوں میں ایک تہلکہ مچ گیا، اس وقت سید صاحب کے مددگاران کے تلمیذ رشید شیخ مفتی محمد عبدہ مصری بھی تھے۔ جو رسالہ کی خدمت میں بڑی حد تک حصّہ لیتے تھے۔ رسالہ کے صرف اٹھارہ پرچے نکلنے پائے تھے کہ یورپ کے کان کھڑے ہوئے خیال کیا کہ اگر رسالہ کی یہی رفتار رہی تو یورپ کی پیچیدہ سیاست کے تمام پردے چاک چاک ہو جائیں گے اور مشرق میں اپنی حکومتوں کی حفاظت مشکل ہو جائے گی اس لئے فوراً حکومتِ فرانس نے رسالہ کو بند کر دیا۔

جب رسالہ بند کر دیا گیا تو مفتی محمد عبدہ بیروت تشریف لے گئے، اور سید صاحب مختلف مقامات کی سیاحت میں مشغول ہو گئے، جہاں جاتے، ارباب علوم و معارف سے ملاقاتیں کرتے، مسائل سیاسیہ میں تبدیل خیالات کرتے اور نہایت غور و فکر سے یورپ و مشرق کی سیاست پر نگاہ ڈالتے اور امتِ اسلام کی بہبودی کی تدبیریں سوچتے۔

سفر ایران سفر یورپ کے دوران میں شاہ ناصر الدین والی ایران سے ملاقات ہوئی۔ سید صاحب کے تبحر علمی، سیاسی قابلیت نے شاہِ ایران کو ان کی طرف مائل کیا

اور ایران چلنے کی فرمائش کی، با صرار و الحاح طہران لے گئے اور نہایت خاطر و مدارات کی، اور رفتہ رفتہ اس قدر ترقی مدارج ہوئی کہ شاہ ناصر الدین نے اپنا معتمد علیہ بنالیا

لیکن دنیا کا معاملہ کچھ عجیب و غریب ہے، حاسدین کسی کا فروغ گوارا نہیں کر سکتے۔ سید صاحب کی طبیعت بھی نہایت آزاد واقع ہوئی تھی، جو کچھ دل میں کھٹکتا، زبان سے کہہ دیتے جس امر کے متعلق خیال ہوا کہ یہ امر خلاف شرع یا خلافِ سیاست ہے تو ناممکن تھا کہ خلافِ عمل دیکھیں اور خاموش رہیں۔

سید صاحب نے دیکھا کہ حکومتِ ایران کے ادارۂ ملوکیت میں بے شمار بدنظمیاں موجود ہیں اور بعض شعبوں میں مظالم ہو رہے ہیں۔ تابِ صبر نہ لاسکے اور فوراً اظہار واقعات کے لئے مجبور ہوئے، اس پر مفسدین اور حاسدین کو موقع مل گیا سید صاحب کے خلاف شاہ ایران کو ورغلایا، طرح طرح کی مفسدہ پردازیاں شروع کر دیں اور ایسی چالیں چلے کہ دونوں کے درمیان دشمنی اور عداوت کی آگ مشتعل کر دی۔ نوبت تا بجدے رسید کہ شاہ ایران سید صاحب کا جانی دشمن بن گیا۔

ایران کا صدرِ اعظم مرزا اصغر خاں جس کا لقب امین الدولہ تھا، وہ آپ کا پہلے ہی سے دشمن تھا، اس لئے کہ سید صاحب کے علوم رتبت، رفعتِ شان، اور تقربِ شاہ ایران کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔ شاہ ایران کو ورغلایا کہ سید صاحب آپ کے اور حکومتِ ایران کے سخت ترین دشمن ہیں اور آپ کے خلاف قوم کو بھڑکاتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ معاملہ خطرناک بن جائے اور تدارک ناممکن ہو جائے شاہِ ایران، امین الدولہ کے ورغلانے میں آگیا۔ اور انتہائی اذیت پر تل گیا سید صاحب کو جان بچانی مشکل ہو گئی، عبد العظیم صاحب کی درگاہ میں پناہ لینی پڑی۔ عبد العظیم صاحب کی شخصیت ایران میں اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اگر کوئی قاتل بھی ان کی درگاہ پر چلا جاتا تو اس کو کوئی گرفتار نہ کر سکتا۔ حکومتِ ایران میں عبد العظیم صاحب کی نگا

ایسی تھی گویا من دخلہ کان اٰمنًا یعنی جو آہیں داخل ہو گیا مامون ہو گیا۔

سید صاحب تقریباً سات ماہ تک عبد العظیم صاحب کی درگاہ میں پناہ گزین رہے، لیکن گرفتاری کے لئے ہر وقت آدمی پیچھے لگے رہتے۔ آخر شاہِ ایران نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ ہی ہو، افغانی کو گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ شاہِ ایران نے پانچ سو مسلح سوار بھیجے۔ اور عبد العظیم صاحب کی درگاہ کا محاصرہ ہو گیا۔ درگاہ کے اندر داخل ہو کر سید صاحب کو گرفتار کر لیا گیا، اور ہتھکڑیاں و بیڑیاں پہنا کر نہایت ذلیل ترین طریقے سے مشکیں کسوا کر سپاہ کی حراست میں حدودِ عراق اور بغداد تک پہنچا دیا گیا۔ شاہِ ایران کے اس سلوک نے سید صاحب کے دل میں ہمیشہ کے لئے عداوت کی گرہ ڈال دی اور انتقام کا جذبہ پیدا کر دیا۔

دربدر کے بعد سید صاحب نے یورپ کا رُخ فرمایا اور سیدھے لندن پہنچے جہاں سید صاحب نے رسالہ "ضیاء الخافقین" جاری کیا جس میں حالات ایران کے متعلق مختلف طریقوں سے بحث کی اور ملک ایران کے مختلف پوشیدہ حالات و واقعات کو طشت از بام کیا۔ اس رسالہ کی اشاعت پر شاہِ ایران سخت برہم ہوا۔ لیکن اُس وقت سید صاحب لندن میں مقیم تھے، شاہِ ایران اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

بار دیگر قسطنطنیہ میں ورود شاہِ ایران اسی حیص و بیص میں تھے کہ سلطان عبد الحمید خاں کی جانب سے سید صاحب کی طلبی کا خط پہنچا۔ یہ ۱۸۹۲ء کا واقعہ ہے سید صاحب نے سلطان کی طلبی پر لبیک کہا اور قسطنطنیہ پہنچے۔ سید صاحب کی یہ دوسری مرتبہ قسطنطنیہ میں تشریف آوری تھی۔ پہلی مرتبہ سلطان عبد العزیز خاں کے زمانے میں تشریف لائے تھے اور اب سلطان عبد الحمید خان نے شاہِ ایران کی فرمائش پر خط لکھا تھا کہ ان کو بلا کر آپ اپنے پاس رکھئے، تا کہ شاہِ ایران کی نسبت رسائل و مضامین نہ لکھیں اور بعض دیگر خطرات سے بھی وہ مامون رہے۔

مبصرین کا بھی خیال تھا کہ سید صاحب کا یہ سفر خطرات سے خالی نہ تھا چنانچہ ہنری روشفور فرانسیسی عالم جو یورپ کا ایک مشہور مدبّر تھا۔ اس وقت لندن میں نظر بند تھا، وہ اس سفر کے بالکل خلاف تھا، کیونکہ اس کا بیان تھا کہ اس طلبی میں ضرور کوئی راز مضمر ہے۔

بہرکیف سید صاحب آستانہ پہنچ کر شاہی مہمان ہوئے۔ آپ کا نہایت شاندار استقبال ہوا اور پرتکلّف سامانِ ضیافت مہیّا کئے گئے اور قیام کے لئے نہایت عمدہ کوٹھی دی گئی۔ اور سلطان کی جانب سے ایک بڑی گراں قدر رقم بطور ماہوار وظیفہ کے مقرر ہوگئی۔

سید جمال الدین افغانی اکثر اوقات سلطان کے پاس آیا کرتے، نماز جمعہ تو ہمیشہ سلطان کے ہمراہ ادا کیا کرتے۔ ایک عرصے تک اسی طرح نہایت اطمینان سے زندگی بسر ہوتی رہی۔ لیکن ہمعصر یہ کب گوارا کر سکتے ہیں کہ سید صاحب خلیفۂ اسلام کے پاس رہیں اور سلطانی تقرب سے فائدہ اٹھائیں۔ سید ابوالہدیٰ صیادی نے ایک تحریر شائع کی۔ جس میں تین شخصوں پر کفر و زندیقیت کا فتویٰ دیا گیا تھا، سید جمال الدین افغانی، سید فضل علوی جعفری، امیر ظفار شیخ طاہر مدنی طرابلسی شیخ طریقۂ شاذلیہ، لیکن سید صاحب کو خاص طور پر متہم قرار دیا۔ آپ کے کفر و الحاد کا فتویٰ تیار کر کے شائع کر دیا۔ ادھر سلطان عبدالحمید خان کی جانب سے آپ کی ہر نقل و حرکت پر احتساب تھا، منٹ منٹ کی خبر سلطان کو پہنچائی جاتی تھی۔ خفیہ پولیس کا آدمی ہر وقت موجود رہتا۔ اتفاق سے انھیں ایام میں عبداللہ ندیم مصری سے کاغذ خانے میں سید صاحب کی ملاقات ہوئی اور اسی اثنا میں خدیو عباس حلمی پاشا کا بھی ادھر سے گزر ہوا جس سے باہم سلام علیکم و علیکم السلام کے مراسم ادا ہوئے۔ اور اسی جگہ تقریباً پندرہ منٹ تک باہم گفتگو بھی ہوئی سید ابوالہدیٰ صیادی کا

کہیں اس ملاقات کا پتہ لگا، فوراً سلطان کو رپورٹ دی کہ سید جمال الدین اور عبداللہ ندیم نے فلاں مقام پر خدیو عباس حلمی سے ملاقات کی۔ اور دونوں نے ایک درخت کے نیچے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے، لیکن جب سلطان نے سید صاحب سے دریافت کیا تو جو بات تھی سید صاحب نے بیان کر دی۔ سلطان کے خیالات کی اصلاح ہو گئی، جذبات ٹھنڈے ہو گئے، غلط فہمی دور ہو گئی۔ اور سید صاحب کا تقرب دن بدن بڑھتا گیا۔ لیکن ایک بات سید صاحب کی سلطان کو بھی سخت ناگوار تھی۔ وہ یہ کہ سید صاحب ہمیشہ ہر مجلس میں شاہِ ایران کی مذمت اور برائیاں کیا کرتے تھے، اور شاہ ایران کے ظلم وجور، استبداد و چیرہ دستیوں کی داستانیں ہر وقت دہرایا کرتے تھے۔ سفیر ایران مقیم آستانہ نے سلطان سے اس کی شکایت کی، سلطان نے آپ کو بلا کر اس معاملہ کو بھلا دینے کی تلقین کی۔ مگر آپ نے بلا تکلف یہ الفاظ کہہ دیئے:۔ ماکنت نادیا ان اترک شاہ العجم حتیٰ انزلہ فی قبرہ ولکن بعد امر امیر المؤمنین بالکف عنہ فلابد لطاعتہ (یعنی شاہِ ایران کو میں اس وقت تک چھوڑنا نہیں چاہتا۔ جب تک کہ میں اس کو قبر میں نہ پہنچا دوں لیکن امیر المومنین کے حکم کو ماننا ضروری ہے لہٰذا اس کا ذکر چھوڑ دیتا ہوں)

سید صاحب نے گو سلطان کے سامنے وعدہ کیا کہ میں آئندہ اس کا ذکر نہ کروں گا۔ مگر سلطان کو اطمینان نہ تھا کہ سید صاحب نے جو کہا اُس پر عمل کریں گے۔ بلکہ خود سلطان بھی سید صاحب سے خائف تھے۔ سید صاحب کی اس گفتگو سے تو سلطان کی طبیعت پر اور بھی زیادہ اثر ہوا کہ یہ تو بادشاہوں کی بھی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے اور جب بگڑ بیٹھتے ہیں تو قبر تک پہنچانے کی فکر کرتے ہیں۔

سلطان کے کہنے سے سید صاحب چند روز خاموش رہے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد پھر آتش غضب مشتعل ہو گئی، اور پھر شاہ ایران کے متعلق ذکر و مذاکرہ ہونے لگا

اتفاق سے انھیں ایام میں سید صاحب کے پاس رضا آقا خاں ایرانی آئے، جن کا لقب "ابوالمذہب" تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کو شاہِ ایران نے سید صاحب کے ہمراہ قزوین کے جیل خانے میں محبوس کیا تھا۔ جیل خانے کی صحبتوں نے سید صاحب اور رضا آقا خاں میں نہایت گہرے تعلقات پیدا کر دیئے تھے۔ جب سید صاحب رہا ہوئے تو دونوں میں جدائی ہوئی، سید صاحب نے سرزمین ایران کو چھوڑ دیا۔ تو رضا آقا خاں بھی رہا کر دیئے گئے۔ جب سید صاحب آستانہ پہنچے تو رضا آقا خاں بھی بغرض ملاقات آستانہ پہنچے۔ اس ملاقات سے سید صاحب کو بہت ہی خوشی حاصل ہوئی، اکثر اوقات حالاتِ ایران، شاہِ ایران کے نقائص، غلطیاں اور بدنظمیاں بیان کرتے۔ ایک دن اثنائے گفتگو میں رضا آقا خاں نے کہا "ایران کی نجات کے لئے میں اپنی جان پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔" سید صاحب نے کہا "اگر یہ ممکن ہے تو پھر دیر کیا ہے؟"

چنانچہ چند یوم قیام کر کے رضا آقا خاں ایران پہنچے، شاہِ ایران سلطان ناصرالدین ایک روز طہران میں جامع عبدالعظیم میں موجود تھا، رضا آقا خاں آگے بڑھا اور ناصرالدین کا فیصلہ کر دیا۔ قتل کرتے وقت رضا آقا خاں نے بآوازِ بلند پکارا "لو یہ سید جمال الدین کے ہاتھ سے لیتے جاؤ۔"

شاہِ ایران کے قتل کے بعد رضا آقا خاں گرفتار ہوئے اور سولی چڑھا دیئے گئے! ادھر سید صاحب کو قسطنطنیہ میں واقعہ کی اطلاع ملی تو بہت ہی خوش ہوئے۔ اور بار بار اثنائے ذکر میں فرمایا کرتے "آج میں اس حقیقت کو سمجھ سکا کہ قوم ایران مُردہ نہیں، زندہ ہے، کیونکہ اُن میں رضا آقاں جیسے انتقام لینے والے لوگ موجود ہیں۔" اس قسم کی بہت سی باتیں سید صاحب کی زبان سے نکلا کرتی تھیں۔ اسی دوران میں "مجلّہ ایلوستر اسیون" جو فرانس سے باتصویر نکلا کرتا تھا، سید صاحب کی

نگاہ سے گزرا، اُس میں رضا آقا خاں کا وہ فوٹو دیا ہوا تھا جو سولی دیئے جانے کے وقت لیا گیا تھا۔ فوٹو بتلاتا تھا کہ رضا آقا خاں سولی پر لٹکا ہوا ہے اور ارد گرد تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ فوٹو دیکھ کر معاً زبان سے نکلا "علو فی الحیاۃ و فی الممات" (یعنی زندگی میں بھی بلند رتبہ اور مرنے کے بعد بھی بلند شان) اور پھر کہنے لگے کیف علقوہ عالیا علیھم حتی یکون ذلک رمزا الی انھم کلھم من دونہ" (دیکھو کس طرح بلند جگہ پر لٹکایا گیا ہے، یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ تمام لوگ اس سے مرتبے میں کم ہیں۔)

سید صاحب پر خفیہ پولیس تو پہلے ہی متعین تھی۔ ان باتوں سے سلطان عبدالحمید خاں کو بھی یقین ہو گیا کہ شاہِ ایران کا قتل آپ کے مشورے سے ہوا ہے سلطان اس بات پر سخت ناراض ہو گیا۔ اور آپ پر سخت نگرانی اور سخت پابندیاں عائد کر دیں اور حکم دیا کہ بلا اجازت سلطانی کوئی شخص سید صاحب سے ملاقات نہ کرے اب آپ ایک کوٹھڑی میں تن تنہا قید تھے کوئی متنفس بھی آپ کے پاس نہ تھا۔

سلطان ناصر الدین کے قتل کے بعد ایرانیوں پر بھی واقعہ کی تحقیقات کر لینے کے بعد ثابت ہو گیا کہ یہ قتل شاہ صاحب کے مشورے سے ہوا ہے، اس لئے حکومت ایران نے سلطان عبدالحمید خاں سے مطالبہ کیا کہ وہ سید صاحب کو اُن کے سپرد کر دیں لیکن سلطان نے ان کی حوالگی سے انکار کر دیا۔ سید صاحب کے علاوہ جو دو آدمی اس قتل کی سازش میں گرفتار تھے اُن کو حکومتِ ایران نے پھانسی کی سزا دی دی۔

سید صاحب ہمیشہ آزاد رہے، آزاد طبیعت رکھتے تھے۔ یہ قید سخت شاق اور ناگوار گزری، آخر موقع پا کر سفیر انگلستان "فیس مورس" کے پاس آدمی بھیجا کہ "میں قید سے سخت تنگ آ گیا ہوں۔ اب میں قسطنطنیہ سے نکلنا چاہتا ہوں۔ انگلستان جانے والے جہاز کے اندر میرے لئے انتظام کرا دیا جائے۔ میں انگلستان چلا جاؤں گا۔"

فیس مورس نے تعمیلِ ارشاد کا پختہ وعدہ کیا۔ چونکہ سید صاحب کے پیچھے سلطانی جاسوس لگے ہوئے تھے، فوراً سلطان کو رپورٹ دی، اس لئے سلطان نے اپنے خاص آدمی کو بھیجکر کہا کہ آپ ہرگز ایسا نہ کیجئے۔ کیونکہ اس میں اسلام کی بےحرمتی ہے۔ آپ کو اسلام اور خلیفۂ اسلام کی حرمت باقی رکھنی چاہیئے۔ خلیفۂ اسلام کی حمیت وحمایت سے نکل کر آپ غیروں کے پاس پناہ ڈھونڈھتے ہیں۔ ہرگز آپ کی شان کے شایاں نہیں۔ سید صاحب کی غیور و باحمیت طبیعت نے اسلام اور خلیفۂ اسلام کے پاس خاطر سفر انگلستان ملتوی کر دیا۔ اسباب وسامان بندھا رکھا تھا۔ کھول دیا اور فیس مورس کو کہا کہ ابھی میں نے اپنا ارادۂ سفر ملتوی کر دیا ہے۔ پھر کسی موقع پر اگر ضرورت ہوئی تو عرض کروں گا۔

باوجود سید صاحب کے ارادۂ سفر ملتوی کرنے کے سلطان نے حراست و نگرانی میں اور زیادہ سختی کر دی۔

بیماری اور سفرِ آخرت شاہِ ایران کے حادثۂ قتل کے چند ماہ بعد سید صاحب کی گردن پر ایک سخت تکلیف دہ ناسور نکل آیا۔ سلطان کو خبر ہوئی تو عمل جراحی کی تجویز کی اور اپنے خاص جرّاح "قمبور زادہ اسکندر" کو اس کے لئے مامور فرمایا۔ اسکندر پاشا بارگاہِ سلطنت کے نزدیک نہایت مقرب اور معتمد علیہ شخص تھا، اُس نے عملِ جراحی کیا۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا، بلکہ دن بدن تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور آخر انجام یہ ہوا کہ زخم بالکل بگڑ گیا۔ اور مورخہ ۹۔ ماہ مارچ ۱۸۹۷ء کو راہیٔ ملکِ عدم ہوئے فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ جامعہ تشویقیہ نشان تاش میں سید صاحب کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور اس کے قریب ایک قبرستان میں مدفون ہوئے۔

وفات کے اسباب سید صاحب کی وفات کے متعلق لوگ مختلف روایتیں بیان کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں، سید صاحب کو پھوڑا نکلا تھا، ممکن تھا، آرام ہو جاتا

لیکن سلطان عبدالحمید خاں نے بوجہ قتل شاہِ ایران قصداً سید صاحب کے پھوڑے کے اپریشن میں بدعنوانی کرائی۔ بعض کا خیال ہے کہ ایک عراقی جراح کے ہاتھ سے یہ کام عمداً کرایا گیا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ سید صاحب کو پھوڑا نکلا، آپریشن کیا گیا۔ مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا اور سفرِ آخرت اختیار کیا۔

سید صاحب کی جلالتِ شان اور حیاتِ عملی امریکہ کا ایک مؤرخ لوتھروپ سٹوڈرڈ LOTHROP STODARD اپنی کتاب "عالمِ حاضرِ اسلامی" میں آپ کے متعلق لکھتا ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتا ہوں:-

"سید جمال الدین افغانی زبردست حکمائے اسلام میں سے تھے، آپ ایک زبردست خطیب و لکچرار تھے۔ پیشانی سے رعب و جلال ٹپکتا تھا، آپ کی قوتِ بیانی، صحیح استدلال، واضح براہین کے لحاظ سے نہایت مؤثر اور ایسی تیر بہدف ہوتی تھی کہ دل میں جاگزیں ہوتی۔ آپ کی آواز میں ایک مقناطیسی اثر ہوتا کہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی، اور سننے والے کو بالکل مسحور کر لیتی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ جہاں گئے قلیل عرصے میں مناصب جلیلہ حاصل کر کے ایسی ایسی اصلاحات کیں اور وہ کام کئے کہ آنے والی قوموں کے لئے ایک بصیرت افروز اور عبرت انگیز درسِ موعظت چھوڑ گئے۔"

آپ ایک بہت بڑے سیاح تھے، عالمِ اسلامی کا گوشہ گوشہ دیکھ ڈالا یورپ کا چپہ چپہ چھان مارا، دنیا بھر کی قوموں کے حالات معلوم کئے، اُن کی بُرائیاں دور کیں اور ہر قوم کی آپ نے صحیح راستہ کی راہنمائی کی۔ بہر حال سیاسی راہنماؤں میں آپ کا مرتبہ سب سے بلند ہے اور ہر ملک و ملت کو ان کے تجربات و ارشادات سے بے حد فوائد پہنچے۔

دینی لحاظ سے آپ ایک بہت بڑے داعیِ حق تھے، آپ نے اپنی تمام قابلیت و استعداد، حق کی نشر و اشاعت میں صرف کی، بڑی بڑی ہستیاں اُن کے آگے

سر تسلیم خم کئے جمع رہتی تھیں، زانوئے طلب وتحصیل تہہ کرتیں۔ گو آپ میں ایک جادو تھا۔ جہاں گئے۔ روحِ اجتماعیہ اور حرکتِ فکریہ کا بیج بویا۔ دلوں کے اندر برقِ اجتماعیت کی ایسی چنگاریاں رکھدیں کہ افتراق وانتشار کی منفرد ہستیوں کو مجتمع کر کے ایک خرمن شعلہ بنا کر مشتعل کر دیا۔

شیخ سنوسی اور سید جمال الدین افغانی کی دعوت اور مسلک ومشن میں صرف اتنا فرق ہے کہ شیخ موصوف نے علوم دین اور ترقی علوم کے اعتبار سے وحدت واجتماع کی روح پھونکی اور جمال الدین افغانی نے محض سیاسیات کے لحاظ سے اس کا حصول قرار دیا۔ آپ نے سب سے پہلے بتلایا کہ یورپ عالمِ اسلامی اور مشرق کا جانی دشمن ہے اور اس کے آئندہ آنے والے خطرات سے مسلمانوں اور مشرق کو خبردار کیا کہ اگر عالمِ اسلامی اسی طرح عالم جمود میں رہا تو اس کی ہلاکت و بربادی لازمی ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے اس کٹھن اور دشوار گزار راستہ میں سید صاحب نے جان جیسی عزیز چیز کو قربان کر دیا لیکن مسلمانوں کو اجتماعِ وحدت کی دعوت اور دولتِ برطانیہ کے طریق کار کی عیاریوں کے بیان کرنے سے باز نہ رہ سکے۔ یہی وجہ تھی آپ سے زیادہ خائف وحراسان یہی مملکت تھی، اور اسی لئے آپ کو ہند میں نظر بند کیا۔ اور جانتی تھی کہ عرابی پاشا کی تحریک آپ ہی کے ہاتھوں سر ہوئی، اور مصر کو یورپ کے اثرات سے پاک کرنا آپ ہی کا کام تھا۔ اور سلطان عبدالحمید خاں کی جامعیّتِ اسلامیّہ میں کامیابی آپ ہی کی سعی وبرکت سے حاصل ہوئی تھی۔

سید جمال الدین افغانی ایک جلیل القدر صاحبِ عزم واستقلال راہنما تھے اور بیداریٔ مشرق کے سیاسی قائد تھے۔ سید صاحب سے پیشتر نصاریٰ نے دنیا میں یہ صُور پھونکا کہ قرآن ترقی سے باز رکھنے والی کتاب ہے اور اس لئے مسلمانوں کو

دنیا میں ترقی کرنے کا کوئی حق نہیں، اسلام اور ترقی دو متضاد چیزیں ہیں اور کبھی ایک جا جمع نہیں ہو سکتیں۔ سید صاحب نے اس کلیہ و نظریہ کا بطلان ثابت کیا اور کتاب اللہ کی تعلیم کو بذریعہ تقریر و تحریر پیش کر کے بتایا کہ قرآن حکیم ہی ایک ایسی کتاب ہے جو دینی و دنیوی ترقی کی جامع و روشن کتاب ہے جس کے سامنے یورپ کی متعصب اور حق شکن ذہنیت کو سوائے تسلیم کے کوئی چارہ نظر نہ آیا۔

سید صاحب نے ان حقائق کو کتاب اللہ و حدیث الرسولؐ سے اخذ کر کے عالم کے سامنے پیش کیا۔ دولِ استعمار کی ذہنیت کا خاکہ اڑایا۔ باطل کا جال توڑا۔ اور حق کو بے حجاب کر کے عالم کے سامنے رکھ دیا۔ لیکن مسلمان خوابِ غفلت میں سوئے رہے نصیحت پر عمل پیرا نہ ہوتے دیکھ کر سید صاحب نے فرمایا۔

ھؤلاء قوم کلما قال لھم الانسان کونوا بنی آدم اجابوہ ان آباءنا قد کانوا کذا وکذا۔ وعاشوا فی خیال ما فعل آباءھم غیر مفکرین بان ما کان علیہ آباءھم من الرفعة لاینفی ماھم علیہ الیوم من الخمول والضعة۔	یہ وہ قوم ہے کہ جب کوئی اسے کہے کہ آدمی بنو، تو یہ جواب دیتی ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد ایسے تھے اور ویسے تھے اور آباؤ اجداد کے کارناموں کے خیال میں زندگی کاٹتی ہے۔ اس کا بالکل خیال نہیں کرتی کہ اس کے آباؤ اجداد کی ترقیاں اس کی بربادیوں اور پامالیوں کو دور نہیں کر سکتیں۔ جو آج اس پر طاری ہو چکی ہیں۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا:-

وھی کلما اراد و بالاعتذار عما ھم فیہ من الخمول	یہ قوم جب اپنی موجودہ مذلت و بربادی کا عذر کرتی ہے تو کہتی ہے کیا ہم نہیں

الحاضر قالوا فلا تردون كيف كان اباؤنا؟ نعم قد كان اباؤكم رجالا ولكنكم انتم رجال كما انتم فلا يليق بكم ان تتذكروا مفاخر اباؤكم الا ان تفعلوا فعلهم

جانتے کہ ہمارے آباؤ اجداد کیسے تھے؟ ہاں تمہارے آباؤ اجداد آدمی تھے، لیکن وہ بھی تم جیسے آدمی تھے۔ پس تمہارے لئے یہ کسی طرح زیبا نہیں کہ اپنے آباؤ اجداد کی بڑائیاں بیان کرو اور تم وہ نہ کرو جو انھوں نے کیا۔

سید صاحب نے مشرق اور مسلمانوں کو بیدار کیا، جگایا، لیکن افسوس مسلمان بستر غفلت سے بیدار نہ ہوئے، بسا اوقات عالم اسلامی کا جمود اور مردہ احساس دیکھ کر سید صاحب مایوس ہو جاتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ فرمانے لگے

قد فسدت اخلاق المسلمين الى حد ان لا امل بان يصلحوا الا بان ينشاء خلقا جديدا وجيلا مستانفا فجيئ الوليد يبق منهم الا كل من هو دون الثانية عشرة من العمر فعند ذلك يتلقون تربية جديدة تغير نهجهم في طريق السلامة۔

مسلمانوں کے اخلاق ایسے خراب ہو چکے ہیں کہ اصلاح کی امید ہی نہیں ہوتی، کیا اچھا ہوتا اگر نئی مخلوق پیدا ہوتی اور نئے دور کی ابتدا ہوتی۔ اور اس وقت جو لوگ ہیں تمام مرجاتے، صرف وہی زندہ رہتے جو ۱۲ سال سے کم عمر رکھتے ہیں۔ اور تربیت جدیدہ میں ان کا اٹھان ہوتا، اور یہ تربیت جدیدہ اُن کو راہِ سلامت و ارتقاء پر پہنچا دیتی۔

بہرحال سید صاحب نے اپنی زندگی عالمِ اسلام اور عالمِ مشرق کی بیداری میں صرف کی اور امّت و قوم کو میدانِ ترقی میں لا کھڑا کر دیا۔ گو بعض اوقات عالمِ اسلام کی غفلت شعاریاں اور جمود و بے حسی اور بداخلاقیاں دیکھ کر بے ساختہ

منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ "لم یبق فی الاسلام اخلاق" (مسلمانوں میں اخلاق ناپید ہو گئے) اور پھر کبھی یہ بھی کہہ دیا "ان المسلمین قد سقطت هممهم، و نامت عزائمهم، و ماتت خواطرهم، و قام شیئ واحد فیهم وهو شهواتهم" (یعنی مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو گئیں، عزائم خوابیدہ ہو گئے قلوب مر گئے، ہاں ایک چیز اُن کے اندر زندہ ہے اور وہ ان کی شہوت پرستیاں)

یہ ارشادات آپ کی قوتِ ایمانی اور قوتِ اصلاحی کی تجلیات ہیں، اصلاحِ قوم اور اصلاحِ ملّت جذبۂ صادقہ کا بیّن ثبوت ہیں ۔ آپ قوم و ملت کو ایک بلند ارفع سطح پر لے جانا چاہتے تھے ۔ اور قوم سُست قدم اٹھاتی تو ایسے الفاظ بے اختیار زبان سے نکل جاتے ۔ سید صاحب عالمِ اسلامی کو اس سطح پر دیکھنا چاہتے تھے جس سطح پر دورِ اول کی مقدس ہستیاں گامزن تھیں اور وحدتِ اسلامیہ کی روح پھونک کر مشرق اور عالمِ اسلامی کو یورپ کی غُلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے اور عالمِ اسلام اپنی سُست رفتاری کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے تو بے ساختہ بارگاہِ الٰہی میں دستِ دعا اٹھا کر عرض کرتے "اللھم اصلح حالنا وانصرنا علی اعدائنا واجعلنا احرارا مستقلین لا عبیدا مستذلین برحمتک یا ارحم الراحمین ۔

اصلاحات و دعوت کا اجمال سید صاحب کی دعوت عالم اسلام کے لئے ایک عظیم الشان دعوت تھی ۔ اگر عالمِ اسلام اور عالمِ مشرق اس پر عمل پیرا ہوتا تو مسلمان ہمیشہ کے لئے غُلامی کی لعنت سے آزاد ہو جاتے ۔ سید صاحب کی دعوت کا خلاصہ ہم مختصر الفاظ میں پیش کرتے ہیں :-

۱ ۔ عیسائیت و نصرانیت، مشرق کی سخت ترین دشمن ہے ۔ اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا اپنا فرض سمجھتی ہے ۔ عالمِ اسلامی کا فرض

ہے کہ اس دشمنِ مغربی سے محفوظ رہے۔ اور ہر ممکن طریقے سے ناموسِ اسلام کی حفاظت کرکے اپنی سیاسی طاقت کو مضبوط کرلیں۔

۲۔ بطرس ناسک نے نصاریٰ میں صلیبی روح اس تعصب اور شدت سے پھونکی ہے کہ اُن کا ہر فرد تعصب مذہبی کی آگ سے شعلہ زن ہے۔ اور عالمِ اسلام کے خلاف جو واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، اسی چیز کا مظاہر ہیں، مسلمانوں کو اپنی بقا کا سامان کرنا چاہیئے۔

۳۔ دولِ متحدۂ یورپ ہمیشہ اسی پروپیگنڈا کو اپنا فرض عین سمجھتے ہیں کہ عالمِ اسلام اپنی حفاظت اور نظامِ مملکت کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لئے ہر ممکن طریقے سے اسے ذلیل ورسوا کرنے اور مٹانے کی دُھن میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی وہ آلاتِ حرب کو استعمال میں لاتے ہیں کبھی مسلمانوں کے نظام میں اختلاف و برہمی ڈالتے ہیں۔ اور کبھی سیاستِ یورپ، کا پھندہ ڈالتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے، اور سلف کے قدوہ واسوہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

۴۔ عیسائیت اپنی خود ساختہ تہذیب کی ترویج کرتی ہے۔ اور اسلام کی مقدس تعلیم کے ہر عمل واخلاق کا مضحکہ اڑاتی ہے، استہزاء، حماقت اور لغویت کے مذموم ناموں سے اُسے بدنام کرتی ہے، اپنی سیاسی آرزوؤں کے حصول کی خاطر اسلام اور مشرق کی قومیت، وطنیت پر حملہ کرتی ہے، شرافت وطنی اور عزت قومی کے جذبات کو ظلم وجور، ناانصافی اور عدوان سے تعبیر کرتی ہے۔ اپنی وطن پرستی سے دنیا بھر کی قوموں کو غلام بناتی ہے۔ اور خود کسی قوم کا تسلّط گوارا نہیں کرتی، غیروں پر اعتراض اور اپنے کو فرشتہ صفت قرار دیتی ہے۔

۵۔ مسلمانانِ عالم کے لئے وحدتِ اجتماعیہ کی سخت ضرورت ہے کہ عالمِ اسلام ایک مرکز پر جمع ہو کر دفاع کے تمام ذرائع و وسائل مہیّا کر کے اپنا ضائع کردہ اقبال دوبارہ حاصل کر سکے، اور دنیا میں زندہ رہنے کے قابل بن کر دینی و دنیاوی لحاظ سے دنیا کی بہترین قوم کہلا سکے۔

از مولینا ابوالکلام آزاد

سیّد جمال الدین اسد آبادیؒ

تقریباً دو ماہ گزرے ہیں۔ کہ ایک شخص سید جمال الدین نامی سے میری ملاقات ہوئی اس شخص کی شخصیت کا میرے دماغ پر جو اثر پڑا۔ وہ ایسا ہے۔ جو بہت کم شخصیتیں مجھ پر ڈال سکی ہیں۔ یہ اثر بہت قوی اور گہرا تھا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ مجھے خیال ہوا سور بون یونیورسٹی کے خطبات کا موضوع یہ قرار دوں کہ "اسلام اور اس کا علم سے علاقہ" سید جمال الدین کی ذہنیت ایک ایسی ذہنیت ہے۔ جو رسمی اسلام کے مؤثرات کی پوری طرح مقاومت کر سکتی ہے۔ میں جب اس شخص سے باتیں کر رہا تھا، تو اس کے افکار کی آزادی، طبیعت کی فضیلت، اور اظہار حقیقت کی جرأت دیکھ کر مجھے خیال ہوا میں اس وقت ان مشاہیر عالم میں سے کسی ایک کو مخاطب کر رہا ہوں کہ دنیا کے گزشتہ علمی زمانوں میں گزر چکے ہیں، اور جن سے تاریخ کے ذریعے ہم نے واقفیت حاصل کی ہے میں گویا ابن سینا، ابن رُشد یا اُن حکماء عظام میں سے کسی حکیم کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا جنھوں نے فکرِ انسانی کو جہل واوہام کے قیود سے نجات کے لئے تاریخ عالم کی پانچ صدیوں تک اپنی شجاعانہ جدّو جہد جاری رکھی تھی[1]"

---

[1] یہ عبارت مشہور فرانسیسی مستشرق ارنسٹ رینان کی ہے۔ (مرتب)

سید جمال الدین انیسویں صدی کی تاریخ مشرق نے اصلاح و تجدد کی جس قدر شخصیتیں پیدا کی ہیں، اُن میں کوئی شخصیت بھی وقت کی عام پیداوار سے اس قدر مختلف اور اپنی طبعی ذہانت اور غیر اکتسابی قوتوں میں غیر معمولی نہیں ہے جس قدر سید جمال الدین کی شخصیت ہے۔ بغیر کسی تامل کے کہا جا سکتا ہے کہ مشرقِ جدید کے رجال تاریخ اور قائدین فکر کی صف میں اُس کی شخصیت کئی اعتبار سے اپنا سہیم و شریک نہیں رکھتی!

وہ ایک گمنام اور مجہول ماحول میں پیدا ہوا۔ ایسے مجہول ماحول میں کہ آج تک یہ بات قطعی طور پر معلوم نہ ہو سکی کہ وہ فی الحقیقت باشندہ کہاں کا تھا؟ اسد آباد کا جو ہرات کے قریب ہے اور افغانستان میں واقع ہے، یا اسد آباد کا جو ہمدان کے قریب اور ایران میں واقع ہے؟

اس کے وطن کی طرح اُس کی ابتدائی زندگی کے حالات پر بھی ظن و تخمین کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ تعلیم و تربیت کا اُسے کوئی موقعہ ایسا نہیں ملا تھا جو کسی اعتبار سے بھی ممتاز اور قابل ذکر ہو۔ انیسویں صدی کے کامل تنزل یافتہ افغانستان اور پنجاب کے علما اپنے گھروں اور مسجدوں میں علومِ رسمیہ کی جیسی کچھ تعلیم دیا کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ تعلیم جو اُس نے حاصل کی تھی، وہ وہی تھی جن استادوں سے اُس نے تعلیم حاصل کی۔ وہ بھی یقیناً معمولی درجے کے تھے۔ اُن میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی علمی شخصیت قابل ذکر ہو۔

دنیا کے نئے تمدنی انقلاب اور نئے علوم سے آشنا ہونے کا بھی اسے کوئی خاص موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس کا ابتدائی زمانہ زیادہ تر افغانستان میں بسر ہوا۔ یا ایک روایت کے مطابق ایران میں، اور یہ دونوں مقامات اُس وقت مغربی تمدن و علوم کی تعلیم و تعلم کا کوئی سامان نہیں رکھتے تھے۔

صحبت اور معاشرت بھی اکتسابی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے
بلکہ بسا اوقات درس و تدریس کی باقاعدہ تعلیم سے بھی کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے
لیکن جہاں تک اس کی زندگی کے حالات روشنی میں آ سکے ہیں۔ کوئی قرینہ اس کا
موجود نہیں کہ اسے مشرق و ایشیا کی عام مقلدانہ و رسمی سطح سے کوئی بلند درجہ
کی صحبت ملی ہو۔

سیر و سیاحت بھی ذہن کی نشو و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن اُس
نے اپنی ابتدائی زندگی میں ہندوستان اور حجاز کے سوا اور کسی مقام کا سفر
نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں مقامات میں کوئی سرچشمہ ایسا موجود نہ تھا۔
جس سے ایک مجتہدانہ فکر و نظر کی پیدائش ہو سکے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں
ان مقامات کا تعلیمی تنزل منتہائے کمال تک پہنچ چکا تھا۔

سب سے زیادہ یہ کہ اُس نے جتنی بھی اور جیسی کچھ بھی تعلیم حاصل کی تھی۔
وہ وہی تعلیم تھی جو بجائے خود مسلمانوں کے ذہنی تنزل کی پیداوار ہے۔ اور کئی
صدیوں سے اسلامی دنیا کے دماغی تنزل کا سب سے بڑا سبب بن گئی ہے۔
اس تعلیم سے ذہن و فکر کی تمام قوتیں پژمردہ ہو جا سکتی ہیں۔ لیکن آزادانہ
نشو و نما نہیں پا سکتیں۔

بایں ہمہ وہ ۱۸۷۰ء میں جب کہ اس کی عمر بمشکل تیس برس کی ہوگی۔
یکایک قاہرہ میں رونما ہوتا ہے۔ اور صرف چالیس دن کے قیام سے اس عظیم
مشرقی دارالحکومت کے تمام علمی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے حتیٰ کہ اس
کی "عجیب اور نئی قسم کی علمی قابلیتوں" کی شہرت دارالخلافہ قسطنطنیہ تک پہنچتی ہے۔
اور اس کی تمام اصلاحی اور انقلابی قوتیں نمایاں ہو جاتی ہیں!

وہ ادبِ عربی کا ایک عجمی متعلم تھا جس نے بعید ترین عجمی ممالک میں عجمی

اساتذہ سے ناقص اور گمراہ قسم کی ادبی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن وہ عربی زبان کے سب سے بڑے مرکز، قاہرہ میں سب سے پہلے صحیح و صالح فنِ عربیہ کا درس دیتا ہے۔ اور عربی کتابت و تحریر کا ایک نیا دور پیدا کر دیتا ہے۔ آج مصر و شام کے تمام مشاہیر اہل قلم اعتراف کرتے ہیں کہ "کتابتِ عربیہ میں ہم سب اسی عجمی کے عیال ہیں"۔ موجودہ دور میں عربی کا سب سے بہتر کاتب شیخ محمد عبدہٗ تھا۔ اور وہ اسی کا شاگرد تھا!

اُس نے علومِ حکمیہ کی جس قدر بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ وہی موجودہ مدارس عربیہ کے متون و شرح کی عقیم و کج اندیش تعلیم تھی۔ لیکن وہ ذہین مستعد طلباء کی ایک جماعت منتخب کر کے علومِ حکمیہ کا درس و املا شروع کر دیتا ہے۔ اور قدیم معقولات کی وہ تمام گمراہیاں ایک ایک کر کے واضح کرتا ہے جن کے اعتقاد و جمود نے صدیوں سے مشرقی دنیا کا ذہنی ارتقاء معطل کر دیا ہے۔

مذہب اور علم دونوں میں اُس کی مصلحانہ ذہنیت نمایاں ہوتی ہے۔ اور کسی گوشے میں بھی اس کے قدم وقت کی مقلدانہ سطح سے مس نہیں ہوتے۔ سیاست میں وہ سرتاپا انقلاب کی دعوت ہوتا ہے۔ اور جہاں کہیں جاتا ہے چند دنوں کے اندر مستعد اور صالح طبیعتیں چن کر انقلاب و تجدّد کی روح پھونک دیتا ہے۔ اُس نے بہ یک وقت مصر، ایران، اور عراق، تینوں مقامات میں اصلاح و انقلاب کی تخم ریزی کر دی!

وہ اپنے اولین قیامِ مصر سے تقریباً بارہ برس بعد پہلی مرتبہ یورپ کا سفر کرتا ہے، اور پیرس میں وقت کے سب سے بڑے فلسفی اور علم و دین کی نام نہاد نزاع میں سب سے بڑے حریف دین و مذہب، پروفیسر رینان سے ملتا ہے، وہ پہلی ہی ملاقات میں اس "عجیب الاطوار مشرقی فیلسوف" سے اس درجہ متاثر

ہوتا ہے کہ اخبار طان میں سید موصوف کے ایک مقالے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"میں نے اس کی شخصیت میں ابن سینا اور ابن رشد کی روح دیکھی" جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ انسان کی قابلیت کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن مخاطب کے تاثر کے لئے وہ بہت کچھ قوتِ بیانیہ اور فصاحتِ تکلم کا محتاج ہوتا ہے۔ جس وقت سید جمال الدین رینان سے پیرس میں اور لارڈ سالسبری سے لندن میں ملا ہے۔ اس وقت اس کی فرانسیسی زبان کی تعلیم کی تاریخ صرف اتنی تھی کہ اثنا رِ قیامِ مصر میں ایک شخص سے لاطینی الف بے قلمی لکھوائی تھی، اور پھر کچھ عرصے کے بعد ایک کتاب خرید لی تھی۔ جو عربی میں فرانسیسی کی ابتدائی تعلیم کے لئے لکھی گئی تھی۔ کوئی ثبوت موجود نہیں کہ اُس نے کسی انسان سے باقاعدہ فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کی ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ فرانسیسی زبان میں بہتر سے بہتر تحریر و تقریر کر سکتا تھا۔ ترکی، روسی اور انگریزی بھی اسی طرح اُس نے سیکھ لی تھی۔

مشہور ہے کہ جب پیرس میں روسی سفیر نے اس سے ملنا چاہا۔ تو اُس نے ملاقات کی تاریخ ایسی مقرر کرائی۔ جو دو ہفتہ بعد آنے والی تھی۔ اُس کے بعد وہ ایک کتب فروش کے یہاں گیا اور اُس سے کہا "مجھے فرانسیسی میں روسی زبان سکھانے والی کتاب چاہیئے۔ میں خرید لوں گا۔ بشرطیکہ تم اس کا بھی انتظام کر دو کہ آج سے ایک ہفتہ بعد کوئی روسی زبان بولنے والا آدمی مجھ سے ملاقات کر سکے"۔ کتب فروش نے کتاب بھی دی، اور ایک ایسے شخص کا انتظام بھی کر دیا۔ جو اُسی کے یہاں ملازم تھا۔ جمال الدین نے ایک ہفتہ تک بطور خود کتاب دیکھی۔ پھر آٹھویں دن سے چودھویں دن تک

روز ایک گھنٹہ روسی سے باتیں کرتا رہا۔ اور پندرھویں دن وہ تیار ہو گیا تھا۔ کہ روسی سفیر سے بغیر کسی مترجم کی وساطت کے ملاقات کرے!

سیّد کے سوانح حیات اگر سیّد جمال الدین کی زندگی میں لوگ اس کے حالات سے واقف نہ ہو سکے، تو یہ چنداں عجیب بات نہیں ہے۔ دنیا نے ہمیشہ اپنے اکابر و اعاظم سے ان کی زندگی میں غفلت برتی ہے، اور جب تک وہ دنیا سے رخصت نہیں ہو گئے ہیں، ان کے حقوق کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ خصوصاً مصلحین و مجددین امم کے لئے تو زندگی میں تغافل اور موت کے بعد تعظیم و احترام۔ اس دُنیا کا ایک عام اور غیر متغیر قانون ہے۔ لیکن یہ صورت حال کس درجہ عجیب اور تاسّف انگیز ہے کہ اس کی وفات پر پورے تیس برس گزر چکے ہیں۔ اور وہ تمام مشرقی ممالک بیدار ہو چکے ہیں۔ جہاں اُس نے اصلاح و انقلاب کی ابتدائی تخم ریزی کی تھی۔ تاہم اس کی زندگی بدستور تاریخ کی روشنی سے محروم ہے اور اس سے زیادہ مشرق کچھ نہیں جانتا، جتنا یورپ کے بعض محبِّ شرق اہلِ قلم نے بتلا دیا ہے!

افسوس اس جہل و غفلت پر! ہم صرف اپنے قدما کی شناخت ہی کے لئے یورپ کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے عہد کے اہل فضل و کمال کے لئے بھی اس کے محتاج ہیں۔ جب تک وہ انگلی سے اشارہ کر کے نہ بتلا دے، ہم خود اپنی قوم اور عہد کے بڑے بڑے انسانوں کو بھی نہیں پہچان سکتے!

ہندوستان میں تو الہلال کی اشاعت سے پہلے غالباً لوگ سیّد جمال الدین کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ ۱۸۷۹ء میں جب وہ حیدر آباد اور کلکتہ میں مقیم تھا

تو ہندوستانی مسلمانوں میں سے صرف ایک شخص یعنی مرحوم عبدالغفور شہباز تھا۔ جسے اس کے فضل و کمال کی تھوڑی سی شناخت نصیب ہوئی تھی، اور اُس کے چند فارسی مقالات کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا۔[1]

---
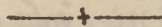
[1] پروفیسر عبدالغفور شہباز، مصنف حیات نظیر اکبر آبادی نے علامہ جمال الدین افغانیؒ کی زندگی میں ان کی اجازت سے ان کے فارسی مقالات کا مجموعہ "مقالات جمالیہ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ مجموعہ ربن پریس کلکتہ سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے دیباچہ میں شہباز نے بتایا تھا کہ وہ "مقالات جمالیہ" کا دوسرا حصہ بھی شائع کرنا چاہتے ہیں جس میں علامہ افغانیؒ کے عربی مقالات کا ترجمہ ہوگا۔ لیکن یہ دوسرا حصہ کبھی شائع نہ ہو سکا۔ اسی طرح ان کے فارسی مقالات کا ترجمہ بھی شہباز شائع نہ کر سکے۔ (مرتب)

از نواب ذوالقدر جنگ بہادر

سیّد جمال الدین الافغانیؒ

انتظامِ قدرت میں انسان کو کیا مجالِ دخل۔ مشاہیرِ عالم کے زرین و غیر فانی کارنامے شاہد ہیں کہ صرف وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو فطرتاً جنگجو ہیں۔ یا جن کو اُن کے رہنما ہمیشہ جنگجوئی کی طرف مائل رکھیں اور وہ قومیں جن کی فطرت امن پسند ہو یا اپنے رہنماؤں کی ہدایت سے انھوں نے امن کی زندگی اختیار کر لی ہے وہ پست اور ذلیل ہوتی جائیں گی۔ دوسرے الفاظ میں، انسان کی ترقی اور ارتقا کے واسطے لازم ہے کہ انسانوں کے طبائع ہر وقت اور ہر لحظہ جدوجہاد اور انقلاب کی طرف مائل رہیں۔ پروفیسر اڈورڈ براؤن کہتے ہیں کہ یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ انقلاب زمانہ ہے جو آدمی کو سامنے لاتا ہے۔ یا آدمی موقع و محل کو خود پیدا کرتا ہے اور اس طرح انقلاب کا بانی ہوتا ہے۔ میری دانست میں دونوں شکلیں لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے کہ ہر صورت میں قدرت نے حضرتِ انسان ہی کو یہ شرف عطا فرمایا ہے کہ مشیتِ الٰہی کو بروئے کار لائے۔ میرا تو مذہباً عقیدہ ہے کہ انقلابِ زمانہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کے علم میں مضمر ہے۔ اور جس قدر انقلابِ دنیوی عظیم ہوگا۔ ہمارے ارتقا کا پایہ بلند ہوگا، مگر شرطِ اول یہ ہے کہ نیّت بخیر ہو ؎

سر و سامانِ وجودم شررِ عشق بسوخت   زیرِ خاکسترِ دل سوزِ نہانم باقیست

بہر حال آج سے ستر سال قبل جو انقلابِ عظیم ممالکِ اسلام میں رونما ہوا، اور جو جوش مسلمانوں میں غرب سے لے کر شرق تک ملّت کی عصبیت اور آزادی کا پیدا ہوا اُس کے آغاز و خاطر خواہ فروغ پانے کے تمام تر ذمہ دار سید جمال الدین تھے۔ کسی ایسی قوم کا بیدار کرنا جو تین سو سال سے دُنیا و مافیہا سے بے خبر محوِ خواب غفلت ہو اور جس کی نیند اصحابِ کہف کی نیند سے کم گہری نہ ہو۔ آسان نہ تھا اور نہ کسی ایک انسان کی عمرِ مستعار اس کام کے واسطے کافی ہو سکتی تھی۔ بس سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جلّ شانہٗ کو مسلمانوں کی بہتری منظور تھی کہ سید جمال الدینؒ کو خلق فرمایا اور یہ کام اُن سے لیا، انھوں نے مراکش سے لے کر سرحدِ چین تک مسلمانوں کو جگایا اور کہا کہ دیکھو کہ ایک بے پناہ سیلاب یورپ سے تمہاری طرف آرہا ہے۔ اگر تم نے آہنی دیوار کو اس کا سدِّ راہ نہ کیا تو تم کو ہمیشہ کے واسطے تباہ کر دے گا۔ یہ سید جمال الدین ہی کی قائم کردہ بنیاد تھی کہ جس پر ان کی وفات کے چالیس سال بعد مصطفیٰ کمال اتاترک نے سرحدِ یورپ پر اور رضا خاں پہلوی نے سرِ قفقاز پر ایسی آہنی دیوار تعمیر کی کہ یورپ اور روس کے سیلاب اس سے ٹکرا کر منتشر ہو گئے۔

پروفیسر براؤن "دی ریولیوشن آف پرشیا" میں تحریر کرتے ہیں کہ سید جمال الدینؒ کی شخصیت نادر الوجود تھی۔ قد و قامت اور وجاہت شاہانہ پُر رعب اور پُر کشش تبحرِ علم اور وسعتِ معلومات، دریائے بے کنار۔ تحریر میں اس قدر غیر معمولی اثر کہ سامعین اور قارئین سب کفن بسر اور شمشیر بکف جان دینے کے واسطے تیار۔ عزم و ارادے کے سامنے دُنیا کی متحدہ قوت عاجز و سرنگوں، فنِ سیاسیات و اخبار نویسی میں مشاہیرِ بیت النصاریٰ مثل ڈزریلی، سالزبری اور بسمارک ان کا لوہا مانتے لگے عرب و عجم کے مسلمانوں نے اپنے باہمی اختلاف کو طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا تھا۔

اور ان کی ہر تجویز پر بغیر دلیل عمل کرنے کے واسطے کمربستہ۔ حالانکہ علامہ شیخ محمد عبدہٗ مصر کے مفتی اعظم علم و دانش میں سید جمال الدین کے ہم پلّہ تھے۔ لیکن مدّت العمر ان کی تقلید اور پیروی کو اپنے واسطے باعثِ فخر و نجات تصوّر کرتے رہے۔ شرق و غرب کے مخالفین ان کے نام سے لرز جاتے تھے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ سراپا احترام خاصانِ خدا میں سے تھے۔

حضرت سید جمال الدین الافغانی کے حالات سے اہلِ ہند اپنی عدم توجہ کی وجہ سے نا آشنا رہے۔ ورنہ زبانِ عربی میں کافی مواد موجود ہے بمقامِ پیدائش کے بارے میں البتہ ایرانیوں کو خود صاحبِ تذکرہ سے اختلاف رہا۔ مثلاً ناظم الاسلام اپنی تصنیف "تاریخ بیداری ایرانیان" میں نہایت وثوق کے ساتھ تحریر کرتے ہیں کہ "یہ قصبہ اسد آباد جو قریبِ ہمدان ہے۔ پیدا ہوئے۔ جہاں اب بھی ان کے اہلِ خاندان موجود ہیں۔ ان کے والد سید صفدر بہت غربت کی حالت میں بسر اوقات کرتے تھے اور زیادہ پڑھے لکھے بھی نہ تھے۔ پانچ سے دس سال کی عمر تک یہیں کے مکتب میں تعلیم پائی۔ آٹھ سال کی عمر میں انھوں نے فارسی اور ترکی میں اچھی استعداد حاصل کر لی تھی۔ دسویں سال یہ گھر سے بھاگ نکلے۔ اور ہمدان، اصفہان، مشہد ہوتے ہوئے کابل آئے۔ جہاں انگریزی پڑھنی شروع کی۔"

مگر میں اس بیان کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ کابل میں اگر کوئی بھولے سے بھی انگریزی کا نام لیتا تو شاید مار ڈالا جاتا۔ خود سید جمال الدین بیان کرتے ہیں کہ یہ ۱۲۵۴ھ م ۱۸۳۸ء میں اُس اسد آباد میں پیدا ہوئے جو قریب کابل واقع اور کابل ہی کے مضافات میں داخل ہے۔ والد کا نام سید صفدر رہے اور نسب کا سلسلہ سید علی الترمذی محدث سے لے کر حضرت

حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ یہ ابھی گود میں تھے کہ سید صفدر کابل آگئے۔ اور ان کی غیر معمولی ذہانت دیکھ کر خود اپنی نگرانی میں تعلیم شروع کی۔ رفتہ رفتہ لیکن آغاز تعلیم سے دس برس کے اندر صرف، نحو، منطق، تاریخ، فقہ، حدیث، تصوّف فلسفہ، ریاضی، ہیئت، طب، تشریح، کلام، طبعیات جملہ علوم اور اُن کے ہر شعبہ پر کافی دستگاہ حاصل کر لی، اٹھارھویں سال پہلی مرتبہ ہندوستان آئے اور یہاں ایک سال چند ماہ قیام میں انگریزی پڑھی۔ اور یورپین فلسفہ اور سائنس کے مطالعے میں مصروف رہے ۱۲۷۳ھ م ۱۸۵۷ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔ اور پھر کابل واپس چلے آئے۔ مگر دل اچھی امیدوں سے بھرا ساتھ لائے۔ ممالک اسلامیہ بعید اور قریب سے جس قدر سربرآوردہ لوگ حج میں شریک تھے۔ سب نے ان کی تجویز اتحاد اور آزادیٔ ملت سے اتفاق کیا۔ اور سب نے ان کو مدعو کیا کہ یہ خود آئیں۔ اور ہر جگہ اس عظیم الشان کام کا سنگِ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھیں۔ ماحصل ان کی تجویز کا یہ تھا کہ سب ممالک اپنے اپنے ملکی معاملات میں آزاد رہیں اور اپنے اپنے مناسب حال اسباب ترقی تلاش کریں۔ لیکن سب کامل اتفاق و یکجہتی کے ساتھ ایک خلیفہ کی اطاعت قبول کریں۔ تاکہ مسلمان اقوام بیت النصاری کا مقابلہ اپنی متحدہ قوت کے ساتھ کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ سلطانِ روم بحیثیت خادم حرمین شریفین اور اپنی وسعتِ سلطنت اور جاہ و جلال کے لحاظ سے اس منصبِ عظمیٰ کی قابلیت رکھتے اور سب مسلمان ان کو خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔ لیکن ان کے اقتدار اور اثر میں وہ ہمہ گیری اور استحکام نہ تھا جو حضرت سید کے پیشِ نظر تھا۔ پس اگر سلطان چاہتے ہیں کہ ان کا اثر و اقتدار دراصل لازوال ہمہ گیری اور استحکامیت پیدا کرے تو ان کو چاہیئے کہ اپنے شخصی اقتدار کو خیرباد کہیں اور طرزِ حکومت بدل دیں اور وہ اصول اختیار کریں جن کو

ممالک اسلامیہ کے نمائندے ایک جگہ جمع ہو کر بالاتفاق طے کریں۔ مرکز خلافت میں بھی ان کو جگہ ملے اور عرب و عجم کی شرکت سے کاروبار خلافت انجام پائے ورنہ دولتِ عثمانیہ سے قطع نظر ہم اپنے حصولِ مقصود میں جو طریقہ مناسب سمجھیں گے اختیار کریں گے۔"

سلطان عبدالحمید خاں کے ابتدائی دورِ حکومت میں جب ان خیالات کی اشاعت مدینہ منوّرہ سے شروع ہوئی تو فوراً بند کر دی گئی لیکن ریگ بطحا کی آتش فشانی مشہور ہے۔ یہ چنگاری بھی اس میں پرورش پاتی رہی۔ کابل واپس آکر سید جمال الدین نے امیر دوست محمد خاں کی رفاقت اختیار کی۔ ہرات کی مہم میں یہ ان کے ہمراہ تھے۔ امیر کے انتقال کے بعد امیر شیر علی خاں نے بمشورۂ محمد رفیق خاں چاہا کہ اپنے تینوں بھائی، محمد اعظم، محمد اسلم اور محمد امین کو گرفتار کر لیں۔ سید جمال الدین محمد اعظم کے ساتھ ہو گئے اور تینوں بھائی اپنے اپنے صوبے میں بھاگ آئے! اس خانہ جنگی کا یہ نتیجہ ہوا کہ محمد اعظم اور ان کے نامور بھتیجے عبدالرحمٰن خاں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ سردار محمد افضل خاں پدر عبدالرحمٰن قید سے آزاد اور امیر بنائے گئے۔ ان کا دورِ حکومت صرف ایک سال رہا۔ ان کے انتقال کے بعد محمد اعظم امیر ہوئے اور سید جمال الدین کے سپرد وزارت ہوئی اگر امیر اپنے بیدار مغز وزیر کے مشورے پر عمل کرتے تو سب کو یقین تھا کہ بہت جلد مستقل اور پائدار حکومت قائم ہو جاتی۔ مگر امیر اپنے اہلِ خاندان سے کچھ ایسے بدظن تھے کہ ان کو کسی قابل اور خیر خواہ رشتہ دار کی شرکت تک گوارا نہ تھی۔ اپنی اولاد میں سے بھی ایسے بیٹوں کو سر خدمت لائے جو کم عمر اور ناتجربہ کار تھے۔ وزیر بالکل بے دست و پا۔ شیر علی نے موقع پا کر قندھار پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے عین وقت پر روپیہ اور سامانِ جنگ سے ان کی مدد کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد اعظم

شکست خوردہ نیشاپور بھاگ آئے اور عبدالرحمٰن نے بخارا میں پناہ لی۔ سید جمال الدین نے قبائل پر ایسا اثر قائم کر لیا تھا کہ شیر علی کی بدسلوکی سے محفوظ رہے۔ بازہم کابل کا قیام خطرے سے خالی نہ تھا۔ بمشکل ان کو حج و زیارات کی اجازت ملی وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ ایران نہ جائیں اور محمد اعظم سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔ یہ فوراً ہندوستان چلے آئے اور حکومتِ ہند کے مہمان ہوئے۔ یہ قوم دوراندیش زمانہ ساز کوئی کام بغیر مصلحت نہیں کرتی۔ اور پھر ایسا کہ جس میں روپیہ خرچ ہو۔ بات یہ ہے کہ پنجاب سرحدِ افغان سے ملحق تھا اور امیر شیر علی خاں کی خوشنودی منظور تھی۔ علاوہ ازیں ان کی حجازی شہرت بھی آہستہ خرام ہندوستان پہنچ چکی تھی۔ مہمان نوازی کے معاوضہ میں ان سے درخواست کی گئی کہ تحریر اور تقریر سے پرہیز اور ایک سرکاری نمائندہ کو اپنی مصاحبت میں منظور کریں۔ تاکہ جو سربرآوردہ ہندوستانی ان سے ملے۔ بوقتِ ملاقات مصاحب موجود رہے۔ مگر جب یہ دیکھا کہ ان کا مکان زیارت گاہِ خاص و عام بن رہا ہے۔ ان کو سرکاری جہاز میں سوئیز روانہ کر دیا۔ جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کی آمد کی اطلاع مصریوں کو ہو چکی ہے۔ اور ان لوگوں نے جن سے یہ حجاز میں مل چکے تھے، غائبانہ ان کا تعارف کرا دیا ہے۔ سرِدست ارادۂ حج کو ملتوی کیا۔ اور باذن و اصرار اہل مصر قاہرہ چلے آئے۔ قاہرہ میں ان کا قیام چالیس روز رہا۔ جامع ازہر کے اساتذہ اور طلبا نے ان کو ایسا گھیرا کہ جس طرح پروانے شمع کو گھیر لیتے ہیں۔ اس قلیل مدت چندروزہ میں تحریر اور تقریر کے ذریعہ سے ایسے نکات انقلاب آمیز سب کے دلوں میں راسخ کئے جو کچھ ہی زمانے کے بعد عربی پاشا اور سوڈانی مہدی کی بیداری کے باعث ہوئے۔ ایمان فروشوں نے اس بیداری کو بغاوت سے تعبیر کیا۔ خدیو توفیق پاشا نے انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں سے مدد چاہی۔ حالانکہ اُس وقت مصر سلطنتِ عثمانیہ کا صوبہ تھا۔

اور خدیو کی حیثیت صوبہ دار کی تھی۔ فرانس نے غیر ملکی خانہ جنگی میں مداخلت سے انکار کر دیا۔ مگر انگریزوں نے اُن معاہدوں کا جوان میں اور سلطان میں تھے کوئی پاس اور لحاظ نہیں کیا اور بے دریغ بندر اسکندریہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ ہزاروں جاں باز ترک اور عرب شہید ہوئے اور عربی پاشا اپنے وطن سے دور جزیرہ سیلون میں قید کر دیئے گئے۔ علامہ شیخ محمد عبدہ مصر کے مفتی اعظم خدمت سے معزول اور جلا وطن ہوئے لیکن

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

یہ واقعہ ۱۸۸۲ء کا ہے۔ اُس وقت سے لے کر آج تک مصر پر انگریز مسلط ہیں۔ مگر سید جمال الدین نے چالیس روز میں وہ کام کیا جو چالیس برس میں دوسرا نہ کر سکتا۔ یا اب مصطفیٰ کمال نے تیرہ برس میں وہ کیا جو ایک صدی میں کسی اور سے ممکن نہ تھا۔ ان کی امیدیں تمام تر ترکوں سے وابستہ تھیں۔ فی الحقیقت اگر سلطان ان کے ہم خیال اور مؤید ہو جاتے تو پھر راستہ صاف تھا۔ اسی امید پر یہ قسطنطنیہ آئے (۱۲۸۵ھ م ۱۸۶۹ء) سلطان عبدالعزیز خاں جلوہ آرائے مسند خلافت تھے اُن کے بھتیجے ہز امپیریل ہائی نس پرنس مراد ولی عہد اور عبدالحمید خاں پرنس مراد کے برادرِ خورد محکمہ خارجہ میں کار آموز تھے، گو روس کی طرف سے افقِ شمالی پر ابرِ سیاہ نمودار ہونے لگا تھا ترکوں کے واسطے یہ زمانہ امن کا تھا۔ ان کی بری قوت فرانس اور روس کی قوت سے ٹکر کھاتی تھی۔ بحری قوت انگلینڈ اور فرانس کے بعد دنیا میں تیسری سمجھی جاتی تھی۔ آسٹریا پرشیا سے شکست خوردہ نیم جان ہو رہا تھا۔ جرمن امپائر ہنوز بسمارک کے تصور میں مخفی تھا۔ فرانس میں نپولین کے بھانجے نے بلقب نپولین ثالث اُس کے نام اور لازوال فتوحات کو اہلِ فرانس کے قلوب میں ایسا زندہ کیا تھا کہ وہ کسی قوت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے

جنگِ کرائی میہ کے بعد جس کے محرک نپولین ثالث تھے۔ فرانس اور فرانس کے بعد انگلینڈ نے قسطنطنیہ میں اپنا اچھا اثر قائم کر لیا تھا۔ سید جمال الدین کی بھی یہی خواہش تھی کہ پرامن طریقے سے اپنے مقصود دلی کو حاصل کریں۔ سربرآوردہ ترک پہلے سے ان کے ہم خیال تھے۔ علی پاشا وزیر اعظم۔ صفوت پاشا وزیر تعلیم اور شیروانی زادہ وزیر کوتوالی نے دھوم سے ان کا خیر مقدم کیا۔ دارالخلافہ کی مشہور انجمن دانش کے یہ اعزازی رکن بنائے گئے تحسین افندی رئیس دارالفنون نے باتفاق حکومت اور علماء ان سے درخواست کی کہ جامعہ میں بزبان ترکی لکچر دیں۔ انھوں نے یہ عذر کیا کہ میں نام ونمود اور داد کا خواہاں نہیں ہوں۔ سرِدست مجھے خاموشی کے ساتھ یہاں کام کرنے کی اجازت چاہیئے۔ سب کے اصرار پر بالآخر یہ راضی ہوئے۔ اور حالانکہ زبانِ ترکی سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ لکچر نے تمام شہر میں ایک دھوم مچا دی۔ یہ شہرت حسن فہمی افندی شیخ الاسلام کو ناگوار گزری۔ جم غفیر اگر ان کے ساتھ تھا تو خاص تعداد با اثر لوگوں کی شیخ الاسلام کی بھی حامی تھی۔ ان پر غلط اعتراض یہ کیا گیا کہ انھوں نے منصب رسالت کو سیاسی گورکھ دھندہ اور رسول کو سیاسی شاطر بتایا ہے۔ اس اختلاف نے ایک فتنۂ عظیم کی صورت اختیار کر لی۔ رفع شر اور بہ مشورہ علی پاشا تبدیل آب وہوا کے بہانے سے مارچ ۱۸۷۱ء میں یہ مصر واپس چلے آئے۔ ریاض پاشا نے ان کے واسطے ایک ہزار روپیہ ماہانہ کا وظیفہ جاری کرا دیا۔ کوئی شرط یا ذمہ داری اس وظیفہ کے ساتھ نہ تھی۔ پھر کیا تھا۔ جہاں باوجود عمدہ سے عمدہ ذرائع حصولِ علم کے مصر میں معدودے چند مصنف اور ادیب مثل عبداللہ پاشا فخری، خیری پاشا، محمد پاشا، مصطفیٰ پاشا تھے۔ وہاں بکثرت ادیب ومصنف ومقرر پیدا ہونے لگے۔ سید جمال الدین روزمرہ جامع ازہر میں یا اپنے مکان پر حدیث،

فقہ، فلسفہ، تصوف، ہیئت، کلام اور اسلام اور یورپ کے سیاسی امور پر لکچر دیا
کرتے اور طلبا کو ان علوم کے حصول اور جدید امور سیاسی میں حصّہ لینے کی
ترغیب دیتے تھے۔ مسلمانوں کی یہ بیداری دیکھ کر برٹش قونصل جنرل مسٹر ویوین
کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے خفیہ طور پر نہ صرف قدیم روش کے ناسمجھ
اراکینِ حکومت اور علماء کو ان سے بدظن کرنا شروع کیا۔ بلکہ خود خدیو توفیق پاشا
کو اس قدر خوف زدہ کیا کہ خدیو نے ان کو اور ان کے ایرانی ہم راز و پیرو ابو تراب
جو ابتدا میں آقا سیّد محمد طباطبائی مجتہد کے شاگرد تھے دونوں کو مصر سے خارج
کر دیا۔ ستمبر ۱۸۷۹ء میں یہ مصر سے راست حیدر آباد دکن آ گئے۔ یہاں فارسی میں
مادیت کی تردید لکھی۔ جس کا ترجمہ عربی میں بمقام بیروت شائع ہوا۔ یہ حیدر آباد
مختار الملک سالار جنگ کی تعریف سن کر آئے تھے اور اس ارادے سے کہ ریاست
حیدر آباد کو جو ایک ہی نشانی مسلمانوں کے عروج و حکومت کی ہندوستان میں
تھی اُس کو اس حالت پر لائیں کہ مسلمانانِ ہند کی سرپرست اور محافظ بن جائے
یہاں شکل کچھ اور تھی۔ ملکِ اودھ تباہ ہو چکا تھا۔ غدر کو بیس ہی برس ہوئے تھے
انتزاعِ حکومت کے بعد چونکہ ملک مسلمانوں سے چھینا گیا تھا۔ انگریز انھی سے
خوف کرتے تھے اور انھی کے ساتھ یہ سختی پیش آتے تھے۔ پس سالار جنگ بفراست
ریاست کی بقا کی فکر و تدبیر میں مصروف تھے۔ اس نازک محل پر دکن کے مسلمانوں
میں اور خصوصاً بلدہ حیدر آباد میں جہاں عرب اور پٹھان سب ہتھیار بند جوشِ
مذہبی سے ان کا ہر رگ و ریشہ متحرک کہ کافر کو مارا تو غازی اور مرے تو شہید،
ذرا سی ترغیبِ جہاد دکن میں غدر کی آگ بھڑکا دیتی۔ شمالی ہندوستان میں
وہابیوں پر تشدد شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے یہ بھی کافی تعداد میں پوشیدہ حیدر آباد
میں پناہ لینے لگے تھے۔ غرض بہ نظر جملہ حالات یہ وقت ایسا نہ تھا کہ سالار جنگ

سید جمال الدین کی موجودگی کو گوارہ کرتے۔ بلدہ میں آثار بیداری دیکھ کر سالار جنگ کی پریشانی بڑھتی گئی۔ مولوی محمد ہاشم بھوپالی نے ہمارے محلے چنچل گوڑہ میں سکونت اختیار کی تھی۔ آدمی نہایت ذی علم اور پر اثر تھے۔ اُس زمانے میں میری عمر دو تین سال کی ہو گی۔ لیکن بعد میں سنا تھا کہ صرف یہی سالار جنگ کے ہم خیال تھے۔ سید جمال الدین نے سالار جنگ کی مخالفت شروع کر دی اور باوجود ممانعت شہر میں پر جوش بیان علانیہ ہونے لگے۔ عین وقت پر سالار جنگ نے بہ حمایتِ انگریزان کو کلکتہ روانہ کر دیا۔ ورنہ کیا تعجب تھا کہ خود ہی ختم کر دیئے جاتے۔ اس اثنا میں مصر میں ان کا اثر رنگ لایا اور عربی پاشا کی بغاوت کے ختم تک کلکتہ میں ایک طرح نظر بند رکھے گئے۔ حیدر آباد کے اثر کو دور اندیش وزیر نے مذاق بنا کر زائل کر دیا۔ ان کے شاگرد رشید مولوی اکبر جو اپنے مکان نبی خانہ میں دفن ہیں جب وعظ کہتے تھے تو شہر کی گلی کوچوں کے لڑکے غُل مچاتے پھرتے تھے ؎

چیخا کئے مولوی اکبر تمام رات بر سرِ ممبر تمام رات

میں نے والد مرحوم سے سُنا تھا کہ سید جمال الدین ہمارے گھر چنچل گوڑہ میں اکثر آیا کرتے تھے۔ اور والد کے ساتھ بوجہ اس کے کہ وہ زبانِ فارسی مثل اہلِ زبان بولتے تھے، بکمالِ شفقت پیش آتے تھے۔ والد کو ایک روز متفکر دیکھ کر سبب پوچھا۔ والد نے کہا کہ ہمارا ایک کام بگڑا جاتا ہے، یہ سن کر دالان کے باہر نکل آئے اور دیر تک آسمان کی طرف دیکھا۔ بعد ازاں اندر آئے اور کہا کہ آغا مرزا اگر تمہارا کام نہ ہوا تو میں اپنی ڈاڑھی منڈا دوں گا۔

کلکتہ سے جب یہ چھوٹے تو انھوں نے اپنے میدان کار کو اور وسیع کیا اور پہلے لندن پہنچے۔ یہاں دنیوی ہوا و ہوس کا عجب تماشہ دیکھا۔ اس قوم نے غدر کے بعد ہندوستان پر اور بغاوتِ عربی پاشا کے بعد مصر پر تسلط حاصل

کر لیا تھا کہ اپنے جامے سے باہر ہو رہی تھی۔ اور غرور میں فرعون کو بھی مات کر دیا تھا۔ یہ یاد نہ رہا کہ :۔

دامن کشاں اگر ہی رود امروز بر زمیں   فردا غبار کالبدش بر ہوا رود

اس یقین کے ساتھ کہ اقوام بیت النصاریٰ میں انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ یہ پارس چلے آئے۔ یہاں ان کا قیام تین سال رہا۔ شیخ محمد عبدہٗ بھی صعوبتِ جلاوطنی برداشت کرتے ہوئے پارس آگئے تھے۔ دونوں نے اپنے اخبار عروۃ الوثقیٰ میں فرانسیسی۔ انگریزی۔ عربی اور فارسی میں انگریزوں کی اس شدت سے مخالفت میں مضامین شائع کرنے شروع کیئے اور ان کو ایسا ہراساں کیا کہ تمام یورپ میں تہلکہ مچ گیا۔ فنِ اخبار نویسی پر اہلِ یورپ کو ناز ہے۔ لیکن اس فن میں بھی سب ان کا لوہا ماننے لگے۔ حکومت ہند نے بمشکل اس اخبار کی درآمد کو ہندوستان میں مسدود کیا اور اس کے ختم کرنے میں سیاہی کوششیں کرتے رہے۔ اخبار عربی اور فرانسیسی دونوں میں شائع ہوتا تھا۔ لیکن کوئی اخبار یا رسالہ غرب اور شرق میں ایسا نہ تھا کہ جس میں مسلمانوں کے اتحاد اور آزادی کے متعلق ان کے انقلاب آمیز خیالات کی ترجمانی نہ ہوتی ہو۔ فرانسیسی زبان پر اس قدر جلد قابو حاصل کر لیا تھا کہ فرانس کے نامور فلاسفر رینان سے "اسلام اور سائنس" پر نوک جھوک ہونے لگی۔ ان کی علمی قدر و منزلت کا ایسا سکہ ارنسٹ رینان کے دل پر بیٹھا تھا کہ خود لکھتا ہے کہ مراکش میں ایک مرتبہ مسجد کے سامنے سے "جب میں گزر رہا تھا تو مسجد کی سادگی اور نمازیوں کے خلوص کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا اور دل نے گواہی دی کہ اگر میں نے کبھی کوئی مذہب اختیار کیا تو وہ مذہب اسلام ہوگا"۔ ...... باوجود شدید مخالفت کے اور عین اس زمانہ میں (۱۸۸۳ء) جب کہ مخالفت اپنی بہار پر تھی، سید جمال الدین

لندن پہنچے۔ خلاف امید نہایت مبالغہ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ حکومت کی طرف سے لارڈ رینڈالف چرچل اور سر ڈرمنڈ ولف نے ان سے ملاقاتیں کیں خود لارڈ سالزبری ان سے احترام کے ساتھ ملے اور سوڈان کے مہدی کی نسبت ان سے کئی بار مشورہ کیا۔ بلنٹ صاحب کہتے ہیں کہ لارڈ سالزبری نے ان کو اپنا طرف دار بنا لینے میں ازحد کوشش کی۔ مگر جس شخص کو دولتِ دنیا کی پرواہ نہ ہو وہ دولتِ برطانیہ کی کیا پرواہ کرتا۔

افسوس ہے کہ عروۃ الوثقیٰ زیادہ دن نہ چل سکا۔ پروفیسر براؤن بھی اصلی سبب اُس کے بند ہونے کا معلوم نہ کر سکے۔ بہرحال جب اخبار بند ہوا سید جمال الدین روس چلے آئے اور ماسکو اور سینٹ پیٹرزبرگ میں تقریباً چار برس بسر کئے۔ زار روس نے ان کی رضامندی حاصل کرنے کے واسطے ...

.... ان کی ہر تجویز کو جس کا تعلق مسلمان رعایا کی اصلاح سے تھا منظور کر لیا اور قرآن اور دیگر مذہبی کتب کی اشاعت کی اجازت بغیر کسی شرط کے دے دی۔ جرجی زیدان اپنی "مشاہیر الشرق" میں تحریر کرتے ہیں کہ پہلی مرتبہ سید جمال الدین ایران ۱۳۰۳ھ؁ ۱۸۸۶ء میں ناصر الدین شاہ قاچار کی طلبی پر گئے تھے اور وزارتِ جنگ ان کے سپرد ہوئی تھی۔ مگر چند ہی روز میں ایسے مایوس ہوئے کہ خود ہی روس واپس ہو گئے۔ پروفیسر براؤن کا قول ہے کہ جب شاہ یورپ کے دورے کے سلسلے میں سینٹ پیٹرزبرگ میں وارد ہوئے اور ان کو معلوم ہوا کہ سید جمال الدین بھی وہاں مقیم ہیں۔ ان سے ملنے کی خواہش کی لیکن انھوں نے اس وقت کسی وجہ سے گریز کیا۔ بعد ازاں میونک میں دونوں ملے۔ ایک ہی ملاقات میں شاہ ان کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ خود درخواست کی کہ یہ ایران کی صدارتِ عظمیٰ کو منظور کریں اور سفرِ یورپ میں ہمراہ رہیں۔ دونوں کی طبیعتوں اور

عزم وارادہ میں زمین آسمان کا فرق۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ناصرالدین شاہ اپنے پنجاہ سالہ طرزِ حکومت کو بآسانی بدلتے۔ ایران میں انگریز اور روس کی شدید رقابت اور خود غرض ایمان فروش مشیروں کے دیرینہ اثر کا زائل کرنا تنہا سید جمال الدین جیسے غیر معمولی شخص سے بھی ممکن نہ تھا۔ مگر جتنا انکار یہ کرتے تھے۔ شاہ کا اصرار شدت اختیار کرتا جاتا تھا۔ آخر ان کو رضامند ہونا پڑا۔ ان کے قدیم دوست سید عبدالقادر المغربی نے بھی ان کو منع کیا۔ سید جمال الدین نے ہنس کر جواب کہ "معلوم نہیں کہ اس غلطی کا موردِ الزام میں ہوں یا خود ناصرالدین شاہ۔ بہتر ہے کہ تم خود شاہ سے پوچھو کہ ایسی حماقت کیوں کر رہے ہیں"۔ شہر میونک بھی دنیا میں یادگار رہے گا شاہ ناصرالدین قاچار اور سید جمال الدین کے یہاں باہمی راز و نیاز نے خاندان قاچار کو تباہ کیا۔ اور اب پچپن برس کے بعد ہٹلر اور چیمبرلین نے اسی شہر میں جو بناءِ اتحاد و یک جہتی قائم کی اس کا نتیجہ پولینڈ کی بربادی اور دوبارہ جنگِ یورپ ہوا۔

جب سید جمال الدین شاہ کے ہمرکاب طہران پہنچے۔ انگلینڈ اور روس نے اپنی رقابت کو سردست ملتوی کیا۔ اور اپنی متحدہ قوت جدید وزیر کے مقابلے میں لے آئے۔ اہلِ دربار سب ان دونوں کے زرخرید غلام تھے! ابن السلطنت اتابک اعظم نے دیگر ایمان فروشوں کی تائید سے شاہ کو سمجھایا کہ سید جمال الدین شاہ کے شخصی اور موروثی اقتدار کو ختم کرنے کے بعد خاندان قاچار کو باقی نہیں رکھے گا۔ شاہ نے پہلے جن تجویزوں سے اتفاق کر لیا تھا۔ ان سب کو رد کرنا شروع کیا۔ اور چند مرتبہ کج ادائی کے ساتھ اپنے وزیر سے پیش آئے۔ وزیر نے فوراً استعفا پیش کیا اور ایران سے رخصت ہونا چاہا۔ جب اس کی بھی اجازت نہیں ملی اور اندیشہ جان کا ہوا تو سید جمال الدین نے عبدالعظیم کی درگاہ میں پناہ لی۔

جس کو اصطلاح ایران میں "بست" کہتے ہیں۔ جسبِ رواج ایران اس درگاہ کا پناہ گزین حکومت کی زد سے بالکل محفوظ ہو جاتا تھا۔ شاہ کی مجال نہ تھی کہ درگاہ کے اندر کسی مجرم کو گرفتار کریں۔ ان کے نام اور کام سے پہلے ہی سب سے با اثر اہل ملک اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ جب یہ وزیر اعظم مامور ہوئے۔ تو حالانکہ یہ سخت حنفی سنّی تھے۔ تمام ملک میں غیر معمولی خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اور ان کی تائید میں زبردست مظاہرے ہونے لگے۔ جو تجویزیں ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کی یہ مرتب کرتے تھے ان کی اطلاع ایران کے ہر گوشے میں فوراً پہنچ جاتی تھی۔ پس جب انھوں نے درگاہ عبدالعظیم میں پناہ لی۔ تو بارہ با اثر جانبازوں نے ان کا ساتھ دیا۔ ان کے منجملہ حسبِ ذیل قابل ذکر ہیں۔ شیخ علی قاروینی (جب خاندان قاچار معزول اور پارلیمنٹ قائم ہوا۔ تو یہ قاضی القضاۃ مامور ہوئے تھے) مرزا آقا خاں کرمانی انھوں نے قسطنطنیہ میں اخبار اختر نامی جاری کیا تھا۔ ابتداء میں جو جوشش ملک میں پھیلا۔ وہ انھی کے چند اشعار ولولہ انگیز کا نتیجہ تھا۔ مثلاً ؎

باایراں مباد آنچناں روز بد — کہ کشور بہ بیگانگاں اوفتد

نہ خواہم زمانی کہ ایں نوعروس — بیفتد بزیر جوانان روس

شیخ احمد کرمانی۔ مرزا رضا خاں کرمانی جنھوں نے ناصر الدین شاہ کو مئی ۱۸۹۶ء میں گولی سے مارا تھا۔ مرزا محمد علی خاں طہرانی (ان کے "ردّ المذہب" نے ملک بھر میں آفت مچا دی تھی۔)

درگاہ میں بست لینے کے بعد سید جمال الدین نے علانیہ شاہ کی مخالفت شروع کر دی۔ شاہ نے انگریزوں اور روسیوں اور اپنے ناعاقبت اندیش مشیروں کے اغوا سے پانسو سوار درگاہ میں بھیج دیئے اور ان کو بجبر سرحد ایران سے باہر کر دیا

پروفیسر براؤن تحریر کرتے کہ ایرانیوں کی نظر میں درگاہ کی بے حرمتی بمنزلہ گناہ کبیرہ تھی۔ جو بعدازاں ناصرالدین شاہ کے قتل اور خاندانِ شاہی کی بربادی کا باعث ہوئی۔

۱۸۹۱ء میں سید جمال الدین دوبارہ لندن آئے۔ اور سفیر ایران پرنس ملکم خاں کے مکان پر پروفیسر براؤن سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں سید جمال الدین نے براؤن صاحب سے کہا کہ جب تک پانچ سات سر نہ کٹیں گے ایران کی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ اور سب سے پہلے ناصرالدین شاہ کا سر کٹنا چاہیئے۔ ملکم خاں دبلے پتلے پستہ قد رنگ گورا آنکھیں سیاہ چمکدار عیسائی مذہب موروثی متوطن ملک ایران ۱۸۷۲ء میں لنڈن میں سفیر ایران مامور ہوئے۔ یہ انھی کا کام تھا کہ ایران کی آزادی اور وقار کو قائم رکھا۔ ورنہ انگلینڈ اور روس کی رقابت آزادی کو باقی نہ رکھتی۔ اور شہنشاہ کج کلاہ ان فرنگی شاطروں کے ہاتھ میں شاہ شطرنج بن جاتا۔ بقول مرزا ہادی وزیر جنگ، فوج ایسی بے قاعدہ اور ناکارہ کہ حیدر آباد کی نظمِ جمعیت سے بدتر۔ صرف شاہ کا باڈی گارڈ تعداد میں بیس پچیس ہزار باقاعدہ اور جدید آلاتِ حرب سے آراستہ، مگر وہ بھی قبضہ سے باہر اس لئے کہ اس کا کمانڈر روسی جنرل لائیفاف تھا۔ شمشیر آبدار برق آثار خراسانی کا اب یہ کام رہ گیا تھا کہ غریب رعایا کی آنکھوں کو خیرہ کرے۔ اور شاہِ کج کلاہ کی تیغ ابرو کا اشارہ صرف اس لئے کہ رعایا کی رگ وجان کو جدا کرے۔

۱۸۹۰ء میں ملکم خاں نے شاہ کو ہوشیار کیا کہ ملک کو انگلینڈ اور روس نے آپس میں تقسیم کر لیا ہے۔ نصف شمالی حصہ روس اور نصف جنوبی حصہ خلیج فارس سے لے کر سرحد ہندوستان تک انگریزوں کے زیر اثر رہے گا۔ اور اپنے اپنے حصے میں دونوں کو اختیار ہوگا کہ امور اقتصادی پر جس طرح منظور ہو قبضہ حاصل

کرلیں۔ سردست پر قبضہ بہ شکل اجارہ ہو گا۔ اگر شاہ کو اپنی اور اپنے ملک کی بقاء منظور ہے تو صنعت و حرفت کی ترقی کے بہانے سے غیر جانب دار حکومتوں کو روسیوں اور انگریزوں کے مقابلے میں کھڑا کر دیں مثلاً جرمن اور فرانس سے فوراً ماہرینِ فن بغرضِ مشورہ طلب کر لیئے جائیں۔ اس پر کمالِ اصرار کیا کہ ملک میں کسی وجہ سے بیداری پیدا ہوئی ہو وہ اب نہ روکی جائے، بلکہ خود شاہ اس کی رہنمائی کے واسطے سامنے آ جائیں۔ گو نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ لیکن اس مشورے کے محرک سید جمال الدین تھے! افسوس کہ یہ سب محنت و سعی لاحاصل ثابت ہوئی ۱۸۸۹ء میں انگریزوں کے نمائندے بارن جولیس ڈی رائٹر نے اسٹیٹ بنک کے قائم کرنے کا اجارہ حاصل کیا۔ جو بعدازاں رائل چارٹر کے ذریعے سے حکومت برطانیہ کے سپرد ہو گیا۔ پرنس ڈالگروکی نے روس کی طرف سے ریل جاری کرنے کی اجازت حاصل کی۔ لاٹری کا اجارہ ایک ایرانی نے بمعاوضہ چالیس ہزار پاؤنڈ لیا جو فوراً ایک انگلش سنڈی کیٹ کے ہاتھ فروخت ہوا۔ مارچ ۱۸۹۰ء میں جب ایران سے خبر آئی کہ تمباکو کا اجارہ ایک انگلش کمپنی نے حاصل کر لیا ہے ملکم خاں نے خدمتِ سفارت سے علیحدگی اختیار کر لی اور بشرکت سید جمال الدین شاہ کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ سید جمال الدین نے مجتہد العصر حاجی مرزا حسن شیرازی کو خط لکھا جس کا ترجمہ پروفیسر براؤن کی کتاب میں درج ہے۔ عجیب پُراثر تحریر تھی جس نے تمام مجتہدینِ ایران کو مرزا حسن شیرازی کی سرکردگی میں سید جمال الدین کا ہم خیال بنا دیا۔ ایک مجتہد شیخ فضل اللہ نوری قوم فروشی کے جُرم میں اپنے ہی خاص مریدوں کے ہاتھ قتل ہوئے۔ سید محمّد طباطبائی اور سید عبداللہ اور دیگر مجتہدین نے مرزا حسن شیرازی کی تجویز سے اتفاق کیا۔ اور فتویٰ جاری ہوا کہ جب تک کہ تمباکو کا اجارہ منسوخ نہ ہو مسلمانوں پر تمباکو کا

استعمال قطعاً حرام ہے۔ گویا شاہ کے مقابلے میں علی الاعلان عدم تعاون یا سول نافرمانی کے واسطے تمام ملک تیار ہوگیا۔ دوسرے روز جب ناصر الدین شاہ قاچار جن کی ابرو کے اشارے پر سر کٹ کر گرا کرتے تھے۔ بیدار ہوئے۔ تو ایران کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک بغاوت کے آثار نمایاں تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر یہ شعر جاری تھے ؎

سر شب سر قتل و تاراج داشت سحر گہ نہ تن سر نہ سر تاج داشت

ظالم ز ستم ہمیشہ لات آمدہ است رُخ رفتہ پیادہ با ثبات آمدہ است

مشروطہ طلب بہ اسپ و پیل است سوار چوں کشتہ وزیر شاہ مات آمدہ است

۱۸۹۲ء میں سید جمال الدین لندن سے قسطنطنیہ آئے سلطان عبد الحمید خاں نے ۷۵ پاؤنڈ بطور وظیفہ ماہانہ مقرر کیا اور سرکاری مکان میں بمقام نشان تاش فروکش ہوئے۔ ایک روز سلطان نے ان سے کہا کہ ناصر الدین شاہ تم سے ازحد خوفزدہ ہو رہے ہیں، ان کے حال پر رحم کرو اور مخالفت سے باز آؤ۔ انھوں نے عرض کیا کہ "بفرمان امیر المومنین میں نے شاہ کو معاف کیا۔" مگر اہلِ ایران بیدار ہو چکے تھے۔ مجتہدوں نے خود شاہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اگر ناصر الدین شاہ اس آخر وقت پر بھی ذرا دور اندیشی سے کام لیتے اور اپنے دوست دشمن کو پہچان لیتے اور ملکم خاں کے حسب مشورہ خود قوم کی رہنمائی کرتے تو آج قاچار ہی برسر حکومت ہوتے۔ مَیں کیمبرج میں تھا کہ یکم مئی ۱۸۹۶ء کو تار سے خبر آئی کہ طہران کے قریب محمد رضا کرمانی نے ناصر الدین شاہ قاچار کو ریوالور سے مار ڈالا۔ پہلا شبہ بابیوں پر ہوا۔ مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ سید جمال الدین اور ان کے پیرو آقا خاں، شیخ احمد کرمانی اور حاجی مرزا خاں پر اس واردات قتل کا الزام

عائد کیا جاتا ہے۔ اور حکومتِ ایران نے سلطان سے ان سب کی تحویل کا مطالبہ کیا ہے، انگلستان اور روس کی تائید سے ایران کے ایمان فروش اجزاءِ حکومت نے خوب کوشش کی کہ سید جمال الدین کو بھی ایرانی نسل سے ثابت کریں لیکن طولانی خط و کتابت کے بعد سلطان عبدالحمید خاں نے ان کی حد تک مطالبۂ تحویل کو نامنظور کیا۔ اور سب ملزمین سفیر ایران کے سپرد ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اہلِ ایران مقیم انگلستان نے لنڈن میں جمع ہو کر شاہ کے مارے جانے کا جشن منایا تھا۔ کوئی ایرانی ایسا نہ تھا کہ جس نے اس جشن میں شرکت نہ کی ہو"

سید جمال الدین نے مارچ ۱۸۹۷ء میں قسطنطنیہ میں انتقال کیا اور نشان تاش کے قریب مقبرۂ شیخ میں دفن ہوئے۔ عمر ۵۹ برس کی تھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ عرب و عجم نے بغیر فرقِ عقائدِ شخصی ان کے ماتم میں آنسو بہائے۔ جرجی زیدان شام کے مشہور عیسائی کا قول ہے کہ گو سید جمال الدین کی دلی تمنا ان کی زندگی میں پوری نہیں ہوئی لیکن اس غیر معمولی دماغ اور ہمت کے شخص نے جو روح کہ مسلمانانِ عالم کے رگ و پے میں پھونکی تھی۔ اس نے ان کی زندگی میں اپنا کام کیا اور وہی اب بھی کام کر رہی ہے اور تا ابد اپنا کام کرتی رہے گی۔ اسی شخص کا اثر تھا کہ مجتہدین ایران نے ناصر الدین شاہ کے قتل پر نہ صرف اہلِ ایران بلکہ جمیع مسلمانوں کو مبارکباد دی۔ انھی کا لازوال اثر تھا کہ ان کی وفات کے سات سال بعد مظفر الدین شاہ کو متنبہ کیا گیا کہ اگر مثل اپنے باپ کے انھوں نے بھی قوم کی آواز کو نہ سنا۔ تو تمام اہلِ ایران مجتہدین اور علماء کی سرکردگی میں سلطان عبدالحمید خان سے التجا کرینگے کہ وہ ملک کو اپنی حمایت میں لے لیں کہ اب ایران میں سنی اور شیعہ کا فرق و امتیاز باقی نہیں رہا۔ انھی کا اثر ہے کہ ممالکِ اسلامیہ سے سلطان عبدالحمید خاں و ناصر الدین شاہ کی مطلق العنانی اور وہ شخصی اقتدار جو آئینِ اسلام کے بالکل خلاف ہے ہمیشہ کے

واسطے نیست و نابود ہوگیا! انہی کی تعلیم لا زوال کا اثر ہے کہ آج ممالکِ اسلامیہ ترکوں کے عروج و وقار کے زیر سایہ پوری اتحاد اور قوت کے ساتھ یورپ کی متحدہ قوت کے مقابلے کے واسطے آمادہ و تیار ہیں۔ سلطان عبدالحمید خاں نے "پان اسلام ازم" کا سبق سید جمال الدین سے سیکھا تھا۔ جس کی آڑ میں وہ مسلمانوں کو دھوکہ دیتے رہے۔ اگر اس سبق کے ساتھ وہ مسلمانوں کی آزادی کے بھی حامی و سرپرست ہو جاتے تو وہ اور ان کا خاندان آج تباہ نہ ہوتا۔

سید جمال الدین کے سببِ موت کی نسبت اختلاف ہے اور اس گمان کی ضرور گنجائش ہے کہ ناصر الدین شاہ کے قتل کے بعد سلطان عبدالحمید خاں ان سے خوفزدہ رہنے لگے تھے۔ شاہ کے قتل کے چند ماہ بعد یہ مرض سرطان میں مبتلا ہوئے۔ مرض ہونٹوں سے شروع ہوا اور حلق تک اتر آیا۔ وثوق کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ سلطان کے اسٹاف سرجن ابوالہدا نے ان کے ہونٹ میں کوئی زہریلا انجکشن دیا تھا جس کے بعد ہی آثار مرض سرطان کے نمودار ہوئے بقول پروفیسر براؤن۔ العلم عند اللہ۔

از علامہ عبداللہ العمادی

مجاہدِ اعظم

جن مجاہدین اسلام نے مشرق کی مظلوم اقوام کے لئے اپنی جانیں وقف کردی تھیں جن کی تمامتر کوشش یہ تھی کہ اسلام از سر نو ابھرے اور ستم رسیدہ مسلمان سربلند ہوں۔ علاّمہ سید جمال الدین اسی زمرے کے نامور بزرگ تھے۔

۱۲۵۴ھ کا زمانہ تھا کہ افغانستان میں پیدا ہوئے۔ وہاں ان کا خاندان "سادات کونر" کے خطاب سے ممتاز و سرفراز تھا۔

مرحوم ان علمائے کرام و مدبرین عظام کے سرخیل تھے جن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اسلام اور مغربی تمدن میں اتفاق ہو جائے۔ وہ ایک نامور فلسفی بھی تھے اور ایک ممتاز مدبر بھی۔

سلطان عبدالعزیز خاں کے اواخر عہد سلطنت میں پہلی مرتبہ قسطنطنیہ میں تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دارالفنون کے نام سے ترکی یونیورسٹی قائم ہو چکی تھی اور تحسین افندی اس کے صدر تھے۔

قیام قسطنطنیہ کے زمانے میں تحسین افندی اور شیخ سلیمان بلخی کے ساتھ مراسم اتحاد بڑھتے رہے۔ آخر الذکر مشاہیر علمائے باختر کے ایک فرد فرید تھے۔ ترکستان سے آکے یہاں رہ پڑے تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے

جوار میں قیام تھا مرحوم اکثر ان کی ملاقات کو جاتے اور علمی و سیاسی مجلس منعقد فرماتے۔

حنیف پاشا ان دنوں وزیر تعلیمات تھے جن کے اصرار سے سید صاحب مرحوم کو مجلس تعلیمات کی رکنیت قبول کرنی پڑی۔

تعلیمات کے اجلاس ہو رہے ہوں یا مسجدوں کی علمی صحبتیں ہوں مرحوم کی عادت تھی کہ ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاتے۔ اور لڑکوں اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو بیدار کرتے۔ ذہنیت کو روشن فرماتے اور خاص اسی افادہ و استفادہ کے لئے کانفرنس بناتے۔

سلطان محمد خاں فاتح قسطنطنیہ کی مسجد میں ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کچھ ارکان سلطنت بھی تھے۔ علماء اعلام بھی تھے۔ بزرگانِ اسلام بھی تھے۔ مرحوم تقریر کر رہے تھے۔ اثناء کلام میں مولوی معنوی کی یہ دو بیتیں سنائیں۔ اور ان کی علمی تشریح فرمائی۔

علم حق در علم صوفی گم شود　　　　این سخن کے باور مردم بود

علم صوفی است و حق قدیم　　　　این چساں در فہم آید اے سلیم

یونس وہبی افندی صدر الصدور تھے۔ اس درسِ حکمت کو غلط فہمی سے کچھ کا کچھ سمجھے۔ خفیہ طور پر شیخ الاسلام حسن فہمی افندی کو انھوں نے بابِ عالی میں تحریک کی۔ اخراج کا حکم ہوا۔ مرحوم چلے گئے اور اسلام بول محروم رہ گیا۔ یونس وہبی افندی کی زود پشیمانی یاد رہے گی کہ حقیقت کو سمجھے تو بہت پچھتائے اور بار بار توبہ استغفار کرتے رہے۔ استبداد کی بیخ کنی ہنظالم کے استیصال عام کی تائید گری ہوئی قوم کو سربلند بنانے کے لئے جامعہ ازہر میں سیاسی و اجتماعی و اخلاقی و فلسفی تقریریں کرتے تھے۔ وہ مشرق کی رہنمائی کے فرائض پندرہ سال تک مسلسل مصر میں انجام دیتے رہے مختلف ممالک کے مشہور ملت پرور اسی حلقہ کے حلقہ بگوش

رہ چکے ہیں جن میں عرب وعجم بھی تھے۔ مصری وترک بھی۔ اور ہندوستانی وتورانی بھی۔ مثلاً علی پاشا جو بعد کو ترکی پارلیمان کے رکن اعظم منتخب ہوئے۔ شیخ محمد عبدہٗ جو مصر کے مفتی ہوئے۔ سعد زغلول پاشا جو وزیر اور آزادگان مصر تھے۔ شیخ علی یوسف جو المؤید کے اڈیٹر تھے۔ فتحی بک جو فرانسیسی میں تاریخ تشریح اسلام کے مصنف ہیں۔ عبداللہ ندیم بک جو نہایت نامور ادیب گزرے ہیں۔ سید محمد مہدی سودانی جو چار سال تک شیخ کے شاگرد رہے۔ احمد اعرابی پاشا کہ جنگ آزادئ مصر کے لیئے مشہور رہوئے۔ ادہم بک مصطفیٰ کامل پادشاہ اڈیٹر "اللواء" یعقوب خاں نواب حسین وغیرہم۔

شاگردوں کا شیوہ تھا کہ شیخ جب تقریر کرتے تو وہ ان کے باطل سوز آتشین الفاظ کو قلمبند کر لیا کرتے۔ املا کا یہ طریقہ ہمیشہ جاری رہا۔ مصر و شام و عراق و ترکی و ایران و توران و ہندوستان میں آج بیداری کے جو آثار نمایاں ہیں۔ ان سب کی ضمیر سید صاحب مرحوم ہی کی جانب راجع ہوتی ہے کہ انھیں کے شاگردوں نے اعادۂ حیاتِ مشرق کی سعی کی اور کر رہے ہیں! استبداد مغرب سے نجات دلانے کا مرجع اپنے زمانے میں وہی تھے۔

مشرقی ممالک میں یہ انقلاب پرور ہستی سرگرم سفر رہی کہ اپنے ہم قوم بھائیوں کو زنجیر ستم سے رہا کرائے۔ ایران و ترکی و مصر نے سب سے زیادہ اثر قبول کیئے جن کے لئے سید صاحب کی کوششیں بھی زیادہ سے زیادہ تھیں۔

سید صاحب کا مقصد یہ تھا کہ جہالتِ استبداد، رشوت اور تعصب کی بیخ کنی کر کے کامل آزادی حاصل کی جائے۔ جدید ترقیات کے میدان میں مشرقی بھی آگے بڑھیں۔ اور قومی زندگی کے کسی مفید شعبے میں مغربیوں سے پیچھے نہ رہیں۔

مشرقی حکومتوں کی تنگ گیری سے مجبور ہو کر شیخ نے پیرس کی راہ لی۔ جو آشیانۂ حریت مشہور تھا۔ دنیائے اسلام کا سب سے اچھا سیاسی و فلسفی رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" وہیں سے شائع کیا۔ انگریزی حکومت کی گلو گیر بندشوں سے آخر اس عربی رسالہ کا دم خفا ہو گیا۔ تاہم اس کے اقتباسات کی شعلہ ریزی ہنوز بجھی نہیں ہے۔ پیرس میں اربابِ علم و سیاست سے شیخ کے مباحثے بھی رہے جو اکثر ضبطِ تحریر میں آچکے ہیں۔

پیرس اور ماسکو کی علمی صحبتوں میں مشرقی فلسفہ اور مشرقی اقوام کے متعلق تقریریں کرتے اور مشرق کا تعارف مغرب سے کراتے۔ سعد زغلول پاشا جو مصر و سوڈان پر انگریزی قبضہ و اثر کے خلاف عمر بھر لڑتے رہے۔ عروۂ وثقی کے اڈیٹرول میں شامل تھے۔ عمامہ کو سر سے اتار رکھا تھا اور اپنے استاد کی تحریک بیداری کے سلسلے میں مشرقی و مغربی علوم کو متحد بنانے میں کوشاں تھے۔

ترکوں سے مرحوم کو بڑی الفت تھی سلطان عبدالحمید خاں نے پہلے بھی دعوت دی تھی ۱۳۱۰ھ میں مکرر فرمان اشتیاق نافذ ہوا اور سید صاحب نے اس کو قبول بھی فرمایا۔ جانتے تھے کہ سلطان ایک مطلق العنان بادشاہ ہے۔ مگر کچھ پرواہ نہ کی۔ اور قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ سلطنت کی جانب سے محلہ نشان تاش کے ایک ایوان میں مقیم ہوئے اور آخر تک شاہی مہمان کی حیثیت میں وہیں رہے۔ دیکھا کہ طرز حکومت سے عام اضطراب لاحق ہے۔ ترک مضطرب ہیں اور نہایت مضطرب ہیں۔ مرحوم نے استبداد کو نیست و نابود کر ڈالنے کی تدبیریں شروع کر دیں کہ آشوب ترک و شور عجم، فتنۂ عرب کی بیخ فساد یہی استبداد ہے۔

اکثر مشاہیر مشرق اسی ایوان میں مرحوم سے ملتے تھے مثلاً بلخ کے نامور عالم برہان الدین کمیشن مہاجرین کے امیر فضل پاشا۔ شیخ الرئیس جو انقلاب ایران کے

محرکِ اعظم تھے! ورایران میں پارلیمان قائم ہونے پر اس کے رکن رکین منتخب ہوئے تھے۔ مرزا آقا خاں کہ جنگِ آزادیٔ ایران میں شہید ہو گئے حسن خان قونصل شیخ محمود۔ محمدؐ صدیق خاں فیضی افندی۔ دربار سلطنت کے خوشامد پیشہ جاسوسوں کی پرچہ نویسی بڑھتی رہی۔ طرفدارانِ استبداد نے چپکے چپکے کچھ ایسا انتظام کیا کہ اسلام کی اس چشم بینا کو نظر بند کر لیا گیا۔ ایوان کی نگرانی ہونے لگی۔ آنے جانے والوں کی تفتیش شروع ہوئی لیکن اعزاز و احترام میں بظاہر کمی نہ ہوئی۔

رمضان ۱۳۱۵ھ میں شیخ علیل ہوئے۔ زنخدان میں ایک پھوڑا نکل آیا سرطان کی صورت پیدا ہو گئی۔ عملِ جراحی بے سود ثابت ہوا۔ اور اسلام کی سود مند ہستی واصل بحق ہو گئی۔ کہتے ہیں زہر دیا گیا تھا لیکن اس کے ثبوت میں قطعی دلائل موجود نہیں محلہ یک اوغلی کے قبرستان "شیخلر" میں مدفون ہوئے! رباب ستبداد نے بہتیری تدبیریں کیں کہ مرحوم کی قبر سے عوام بے خبر رہیں۔ لیکن یہ سب مذبوحی حرکتیں رائگاں گئیں بسلمانوں کا دل شیخ کی آرامگاہ ہے۔

"در سینہ ہائے مردمِ دانا مزار اوست"

از مبارز الدین رفعت ایم۔ اے

شاہین سیّد

اقبال نے اپنے کلام میں صاحبِ کردار مردِ مومن کو "شاہین" سے تشبیہ دی ہے، یہ صرف شاعرانہ خیال آفرینی نہیں۔ بلکہ اسلامی فقر کی جتنی خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب اس میں پائی جاتی ہیں۔ اقبال نے ایک معترض کے جواب میں شاہین کی پانچ خصوصیات گنائی ہیں۔ شاہین کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بلند پرواز ہوتا ہے، دوسری خصوصیت یہ کہ وہ کبھی اپنا آشیانہ نہیں بناتا تیسرے یہ کہ وہ دوسروں کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا چوتھی خصوصیت یہ کہ اپنے شکار سے کل کے لئے کچھ اٹھا نہیں رکھتا، اور پانچویں خصوصیت یہ کہ کم آمیز ہوتا ہے۔ یہی پانچ صفات اسلامی فقر کا خلاصہ ہیں۔

اس تعریف کے لحاظ سے گزشتہ صدی میں دنیائے اسلام نے جتنی بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں ان میں غالباً شاہین کہلانے کے سب سے زیادہ مستحق علامہ جمال الدین افغانی کی ذاتِ گرامی ہے۔ ان کی زندگی شاہین زادگی کی ایک مفصل شرح کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاہین کی اولین خصوصیت اس کی بلند پروازی ہے افغانی کی بلند پروازی سے کس کو انکار ہوگا؟ وہ شخص جس نے اپنی دور اندیشی سے غائر نظری سے کام لے کر امت اسلامیہ کو اپنے طویل خواب غفلت سے جگایا

جو اسلامی ممالک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہدایت کی مشعل لئے پھرتا رہا جس نے ایران، مصر، ترکی میں سیاسی انقلاب برپا کر دیا جس کی تعلیمات نے دنیائے اسلام کو جدید زمانے سے اپنے آپ کو ہم آہنگ بنانے پر آمادہ ونیاں کر دیا جس نے اتحادِ اسلام کا نعرہ لگایا اور روئے زمین کے مسلمانوں کو کلمۂ حق کے جھنڈے تلے مجتمع کرنے کی کوشش کی، جس کے دردمند خطبوں نے عہدِ رسالت صلعم کی یاد تازہ کر دی۔ اور جس کے نالۂ صبح گاہی نے دورِ صحابہؓ کو زندہ کر دیا!

سید شاہین تھا، اس لئے بلند پرواز تھا، وہ گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ نہ تھا، اس کی نظر اس سے زیادہ اہم، اس سے زیادہ وقیع مسائل پر پڑتی تھی ہر شخص سوال کرتا تھا، آپ کا مذہب کیا ہے، اس کا شاہین کے پاس ایک ہی جواب تھا "مسلمانم" اور سنیئے۔

"روزی در مجلس درس یکی از علمائے تسنن صاحب مجلس از سید مرحوم پرسیدہ بود کہ درچہ عقیدہ می باشی۔ فرمودہ بود "مسلمانم" صاحب مجلس دوبارہ پرسیدہ بود "از کدام طریقت" سید فرمودہ بود "کسی را بزرگتر از خود نمی دانم کہ طریقت او را قبول نمایم!"

شاہین کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنا آشیانہ کبھی نہیں بناتا، جمال الدین نے کسی ملک کو اپنا ملک نہیں کہا، ہر ملک ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست، ہر اسلامی ملک ان کا اپنا ملک تھا، اور تو اور آج تک بھی دنیا یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ افغانی تھے یا ایرانی؟ ہاں، نہ وہ ایرانی تھے نہ افغانی، کیونکہ

مردِ حر بیگانہ باشد از ہر قید و بند

اسلامی ممالک میں جہاں کہیں وہ اپنی ضرورت محسوس کرتے، اسلام کو

جہاں کہیں ان کی خدمات کی ضرورت ہوتی، وہاں پہنچ جاتے، افغانستان، ہندوستان، ایران، مصر اور ترکی یہ تو خیر اسلامی ممالک تھے ہی، روس، انگلستان، فرانس اور ایک روایت کی رو سے امریکہ تک، رقیبوں کے کوچوں میں وہ "نقش پا کے سجدے کے سلسلے میں سر کے بل گئے"، سر سید، سعد زاغلول، مصطفیٰ کمال نے صرف اپنی قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، یہ سعادت صرف شاہین سید کے نصیب میں لکھی تھی کہ وہ پوری دنیائے اسلام کی خدمت کا بیڑا اٹھائے جغرافی حدود کے اندر محدود قومیت شاہین کے سدّراہ نہ تھی!

شاہین سید نے نہ تو کہیں اپنا آشیانہ بنایا اور نہ اس آشیانے کے لئے کسی ہم جنس کو ڈھونڈا۔ سلطان عبدالحمید خاں کے اس پیش کش کا کہ وہ ان کے خاندان میں کسی سے شادی کرلیں، یہ جواب تھا:۔

"سلطان می خواہد کہ من زن کنم، من زن می خواہم چہ کنم؟ من دنیائے بایں خوبی وایں بزرگی رابزنی نگرفتہ ام!"

آپ جانتے ہیں۔ شاہین کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کا شکار نہیں کھاتا۔ سید چاہتے تو بادشاہوں سے کافی مال و دولت اینٹھ سکتے تھے، اور بڑے سے بڑا دنیوی منصب پا سکتے تھے۔ لیکن شاہین کو اس کی ہوس نہیں ہوتی ایسا کرنا اس کی پرواز میں کوتاہی لاتا۔ اور ایسا رزق اس کی موت کا باعث ہوتا ہے مصر سے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں اخراج عمل میں آیا ہے۔ جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں، ایرانی سفیر مصر نے ایک ہزار گنی پیش کئے ہیں کہ "فی الحال اسے قبول کیجئے"۔ شاہین بھلا اسے کیسے قبول کرسکتا۔ جواب دیا:۔

"شیر جہاں کہیں جاتا ہے اپنا شکار آپ مہیا کرلیتا ہے!"

میونخ میں ناصر الدین شاہ قاچار سے ملنے کے بعد ایک قطیر رقم اور الماس کی

انگشتری تحفۃً شاہ نے انھیں بھیجی۔ دونوں چیزیں لینے سے انکار کرتے رہے۔ پھر جن کے پاس ٹھیرے ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت اصرار کیا تو رقم تو بہرحال واپس کردی، اور چلتے ہوئے انگشتری بھی ان کے بیٹے کے نذر کردی!

شاہین اپنے شکار میں سے کل کے لئے کچھ اٹھا کر نہیں رکھتا، جو کچھ موجود ہوتا ہے کھا لیتا ہے، کھلا دیتا ہے، لٹا دیتا ہے۔

"سید دربارۂ مہمانان و مسافران ہمیشہ جوانمردی و سخانشان می داد، و ہر یکی را بقدر خور قدر و مرتبہ نوازش می کرد، فقراء و ضعفاء را پول می داد و اغنیاء و نجبا را بہ سماط نشاند و در وقت خوردنِ طعام با مسافراں اغلب بہ این و آں کردہ می گفت "تفضل، تفضل، بخورید کہ ایں مائدۂ سلطانی است۔ چشیدن آں ثواب است۔" اما خود قناعت با چند لقمۂ سبزی یا ترشی می کرد۔"

اسباب دنیوی میں سے اس کے پاس کیا تھا، سنیئے۔

"غیر از دو دست لباس فاخر و یک کتب خانۂ مہم (۱۲ صندوق شتری) از اسبابِ دنیا چیزے دیگرے نداشتہ، و بقولِ خودش در پیراہن آں اسراف می نمودہ!"

اللہ اللہ! اپنے لئے کپڑوں کے دو جوڑے بھی ان کے پاس اسراف میں داخل تھے!

لیکن یہ رہبانیت نہ تھی۔ جوگی بنا اور دھونی رمانا نہ تھا، بارہا خود کہتے تھے "دو نوعِ فلسفہ در دنیا ہست، یکے آں کہ ہیچ چیز در دنیا مال ما نیست و قناعت بہ یک قرقہ و یک لقمہ باید کرد۔ و دیگر آں کہ ہمہ چیز ہائے خوب و مرغوب دنیا مال ماست، و باید مال ما باشد۔ ایں دو یمی خوب است، ایں دو یمی را باید شعار خود ساخت، نہ اولی کہ بہ پشیزی نمی ارزد!"

شاہین کم آمیز ہوتا ہے۔ سید شاہین تھا۔ کم آمیز تھا، کہیں پڑھا ہے آپ نے
کہ سید کی خدمت میں فلاں شہر کے لوگوں نے سپاس نامہ پیش کیا، فلاں ملک میں
ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ جلوس نکالے گئے، ہاتھی پر نہ سہی، موٹر پر، گھوڑے پر،
اونٹ پر! اپنے لئے وہ کس سے ملا۔ کس کی خوشامد کی، کس کے آگے ہاتھ جوڑے
کس کی شان میں قصیدے نہیں نظم ہی لکھ دی ہو! ہاں اسلام کے لئے اپنے
مقصد حیات کے لئے۔ وہ گداؤں سے لے کر شاہوں سے ملا، اسلام کے لئے مسلمانوں
کے حقوق کے لئے سب سے لڑتا جھگڑتا، عاجزی اور منت سماجت کرتا پھرا،
اس مقصد کے لئے عوام سے، خواص سے، علماء سے، طلباء سے، امیروں اور
عہدہ داروں سے، وزیروں سے بادشاہوں سے، سب سے ملتا رہا۔ غرض ــ

کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

یہ سب کچھ تو تھا اسلام کے لئے، اپنے لئے کیا تھا۔ جلوت میں خلوت،
حضور میں غیب، اور غیب میں لذت!

ان کی جلوت تو پورے مسئلہ شرق کی تاریخ ہے۔ لیکن ان کی خلوت گزینی اور
کم آمیزی کا بھی حال آپ کو کچھ معلوم ہے؟ وہ خلوت گزینی جس کے متعلق خود انھی
کی زبان سے اقبالؔ نے ادا کرایا ہے ؎

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید	مدتی جز خویشتن کس را ندید
گرچہ داری جان روشن چوں کلیم	ہست افکار تو بے خلوت عقیم
از کم آمیزی تخیل زندہ تر،	زندہ تر جوئندہ تر تابندہ تر!

آیئے ان کی خلوت گزینی اور شب زندہ داری کا بھی نظارہ کیجئے،

سید جمال الدین تمامی ماہ رمضان در اسلامبول سراسر روزہ دار بود، و شب
زندہ دار، و شب ہا را السجود، بجائے از کار و عبادات و مذاکرات علمی و فلسفی با آشنایان و

ادبا و فضلا و رجالِ سیاسیِ شرق در مہمان خانۂ سلطان بسر می برد..... در چنیں شبہا گاہی بے ہیچ مقدمہ روی بہ شخص علی الاطلاق یا بہ فرقہ پوشی از میان مہماناں کردہ از سر شوخی می گفت: "ای درویشِ فانی! از چہ می اندیشی، برو، نہ از سلطان بہ ترس نہ از شیطان!"

اور وہ اپنی زندگی میں مذہب کے اصولوں ہی کا نہیں، جزئیات تک کا پابند تھا! اور سچ پوچھئے تو سچّا اور پکّا صوفی تھا!

"سید جمال الدین با وجود داشتن یک مشرب فلسفی علی رغم جزئی تمایلش در ظاہر بہ طریقت صوفیہ، سالک مذہب حنفی بود، و اہتمام شدید بہ ادائی فرائض مذہبیہ داشت۔ چنانکہ شیخ محمد عبدہٗ خود می گوید "ھو اشد من رأیت فی المحافظۃ علی اصول مذھبۃ وفروعۃ"۔"

افغانی اپنوں اور غیروں کی نظر میں

افغانی کی شخصیت یہ امر ہنوز بحث طلب ہے کہ آیا بڑے آدمی بڑی تحریکوں کو جنم دیتے ہیں یا بڑی تحریکیں بڑے آدمیوں کو لیکن اس میں شک نہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اور مسلم اقوام کے اتحاد اور آزادی کی تحریک میں سید جمال الدین سے بڑھ کر کسی نے حصّہ نہیں لیا۔ جمال الدین ایک زبردست کردار، گہری علمیت، ان تھک سرگرمی، بے نظیر شجاعت، تحریر اور تقریر دونوں میں غیر معمولی فصاحت، نہایت وجیہہ اور شاندار شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بہ یک وقت فلسفی، ادیب، خطیب اور اخبار نویس سب ہی کچھ تھے۔ لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک زبردست سیاس تھے۔ ان کے مداح انھیں ایک زبردست محب وطن سمجھتے تھے اور مخالف ایک خطرناک باغی۔ انھوں نے بہ اوقاتِ مختلف اسلامی ملکوں اور بیشتر یورپی صدر مقاموں کا دورہ کیا، اور اس طرح مشرق اور مغرب دونوں میں اپنے ہمعصر مشاہیر سے کبھی دوستانہ اور بیشتر معاندانہ قریبی تعلقات پیدا کئے۔

......غرض یہ تھا اس غیر معمولی شخص کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ جو کم سے کم بیس سال کی مدت میں غالباً اسلامی مشرق کے واقعات پر اپنے تمام ہم عصروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اثر انداز ہوا۔ ان کی تاریخ لکھنا عہد حاضر میں بوئے

مسئلہ شرق کی تاریخ لکھنا ہے۔ اس میں ہمیں افغانستان، ہندوستان اور بہت بڑی حد تک ترکی اور مصر اور ایران کو شامل کرنا ہوگا۔ ان مؤخرالذکر ملکوں میں ان کا اثر و نفوذ مختلف شکلوں میں ہنوز ایک زندہ قوت ہے۔

...... اس غیر معمولی شخص کے متعلق ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے جو ایک زبردست سیاح اور عالم تھا اور جس کے پاس مادی ذرائع میں سے ایک فصیح زبان و قلم، عمیق اور وسیع علمیت کے ساتھ گہری سیاسی بصیرت معاملہ فہمی اور اسلام کے ساتھ سچی محبت (جس کے انحطاط پر وہ دل سے آزردہ تھے) کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ بات حرف بہ حرف صحیح ہے کہ انھوں نے بادشاہوں کو اپنے تخت سلطنت پر سہما دیا۔ اور مدبروں کے نہایت غور و فکر سے سوچی ہوئی تجاویز کو ان قوتوں کو بیدار کر کے درہم برہم کر دیا جن سے کام لینا وہ بخوبی جانتے تھے۔ یورپی اور ایشیائی سیاس ان قوتوں کا مقابلہ کرنے میں بالکل ناکام رہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہ وہی تھے جو مصری تحریک قومیت کے رہنما تھے۔ یہ تحریک جو اگرچہ ۱۸۸۲ء میں شروع ہوئی، اب تک ایسی قوت ہے جس کا مقابلہ کرنا باقی ہے۔ یہ انھی کی ذات تھی جن کے لیے بہت بڑی حد تک ایران کی موجودہ تحریکِ مشروطیت مرہونِ منت ہے انھوں نے آزاد اسلامی ممالک کی بیداری کے لیے بڑا کام کیا، اور انھیں بڑی بڑی یورپی سلطنتوں کی زیادتیوں کے فوری خطرے کے خلاف آپس میں عاجلانہ اتحاد کی دعوت دی۔ ان کو اس معنی میں جس کی تعریف خود اسلام نے کی ہے۔ اتحاد اسلام کا بانی قرار دینا بالکل قرینِ انصاف ہے ان کا اثر و نفوذ اور بھی گہرا ہوتا اگر ان کو کوئی ایسا سمجھدار اور حسبِ منشا مسلمان حکمران مل جاتا جو ان کے خیالات کو پوری پوری طرح سمجھ سکتا، اور حب وطن اور جوشِ اسلام سے سرشار ہو کر ان پر عمل پیرا ہوتا۔

(انقلاب ایران) پروفیسر اے، جی، براؤن

ناکام کامیاب مشہور نصرانی عالم جرجی زیدان اپنے تذکرہ مشاہیر شرق "مشاہیر الشرق" میں سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بعد جن الفاظ پر اسے ختم کرتے ہیں اس کے متعلق براؤن لکھتے ہیں:۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ الفاظ ایک مسلمان کے قلم سے نہیں بلکہ ایک شامی عیسائی کے قلم سے نکلے ہیں۔ مشاہیر الشرق ۱۹۰۵ء میں لکھی گئی تھی۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک بہت سے واقعات نے خصوصاً ایران میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ سید جمال الدین نے جن قوتوں کو بیدار اور متحرک کر دیا تھا۔ وہ برابر اپنا کام کر رہی ہیں۔"

جرجی زیدان نے لکھا تھا:۔

ان کی زندگی اور کارناموں کے مختصر حالات پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ مقصد جو ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا۔ اور وہ مرکز جس پر ان کی تمام امیدیں ہمیشہ مجتمع رہیں "اتحاد اسلام" تھا۔ اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک سلطنت میں متحد کر کے واحد خلیفۂ اسلام کے تحت لانا تھا۔ اسی کوشش میں انھوں نے اپنی تمام طاقت صرف کر ڈالی۔ اور اسی مطمح نظر کو حاصل کرنے میں انھوں نے دنیاوی آسائشیں قربان کر دیں۔ حتی کہ شادی بھی نہ کی اور کوئی خاص پیشہ بھی اختیار نہ کیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ لیکن انھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کے دلوں میں ایک زندہ روح پھونک دی۔ ان کی قوتوں کو بیدار کیا! ور ان کے قلم کو قوت بخشی، مشرق نے ان کی جاں فشانیوں سے فائدہ اٹھایا ہے، اور ہمیشہ اٹھاتا رہے گا۔

(مشاہیر الشرق) **جرجی زیدان**

سید کا کارنامہ جمال الدین بہت بڑے سیاح تھے اور نہ صرف دنیائے اسلام سے

کماحقہ واقف تھے۔ بلکہ مغربی یورپ سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ مسلسل سیاحتوں اور وسیع مطالعہ کے سبب ان کی معلومات بے انتہا وسیع ہو گئی تھیں۔ جسے انھوں نے گوناگوں تحریکوں میں مؤثر طریقے سے استعمال کیا۔ وہ پیدائشی مبلغ تھے اور اس حیثیت سے لوگوں کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کر لیتے تھے۔ دنیائے اسلام میں جہاں کہیں وہ گئے۔ ان کی زبردست شخصیت نے ذہنی انقلاب پیدا کرنا شروع کر دیا۔ شیخ سنوسی کے برعکس انھوں نے مذہب سے بہت کم سروکار رکھا اور بتمام وکمال سیاست میں منہمک رہے۔ جمال الدین پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مغربی غلبہ کے آنے والے خطرے کو اچھی طرح سے محسوس کر لیا تھا۔ اور انھوں نے بقیہ عمر اسلامی دنیا کو اس خطرے سے آگاہ کرنے اور مدافعت کرنے کے پیچیدہ ذرائع معلوم کرنے میں صرف کر ڈالے۔ یورپی نوآبادیوں کے حکام انھیں خطرناک شورش پسند قرار دیتے تھے خصوصاً انگریز ان سے خائف رہتے اور ان سے سخت سلوک روا رکھتے تھے......

سید نہایت ذکی اور فہیم شخص تھے۔ اور ان میں بہت زیادہ مقناطیسی قوت ودیعت کی گئی تھی۔ وہ کام کرنے کی غیر معمولی طاقت رکھتے تھے سید نے ۱۸۹۶ء میں بڑی عمر کو پہنچ کر انتقال کیا اور آخر وقت تک مستعدی سے کام کرتے رہے

(جدید دنیائے اسلام) لاتھراپ اسٹاڈرڈ

(یہ اقتباس فرانسیسی رسالہ "روی دیو مانہ موسلمان" بابتہ مارچ ۱۲۹۲ء سے لیا گیا ہے مضمون نگار نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ مگر اڈیٹر کے نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کسی اہل الرائے مسلمان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ دیکھئے "جدید دنیائے اسلام" مصنفہ لاتھراپ سٹاڈرڈ ص ۵۳-۵۴)

سید کی تعلیمات عیسائی دنیا باوجود اس کے کہ نسل وقومیت کے اعتبار سے خود

اس میں اندرونی اختلافات موجود ہیں، مشرق بالخصوص اسلام کے خلاف ہے، اور تمام اسلامی ممالک کو تباہ کرنے کے لئے مستعد ہو گئی ہے۔

صلیبی لڑائیوں کی اسپرٹ ابھی تک قائم و برقرار ہے۔ اور پیٹر اعظم کی تعصبانہ روح بھی جوں کی توں موجود ہے۔ عیسائی دنیا دل میں اسلام کو دیوانہ وار نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کا اظہار کئی طریقوں سے ہو رہا ہے۔ مثلاً بین الاقوامی قانون کو لو، اس میں مسلم اقوام کو عیسائی اقوام کے مساوی درجہ عطا نہیں کیا گیا۔

اسلامی ممالک کے خلاف جو تذلیل اور بے عزتیاں روا رکھی جاتی ہیں، ان کے متعلق عیسائی دول یہ کہہ کر عذر خواہی کر لیا کرتی ہیں کہ یہ ممالک غیر ترقی یافتہ اور وحشیانہ حالت میں ہیں۔ لیکن یہی سلطنتیں ہزارہا طریقوں سے جن میں جنگ بھی شامل ہے۔ اسلامی ممالک میں اصلاح اور ترقی کی ہر شروع کردہ کوشش کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

اسلام سے نفرت رکھنا تمام عیسائیوں میں مشترک ہے۔ اور اس اسپرٹ کا نتیجہ اسلام کی تباہی کی خاموش اور مسلسل صورت میں نکلتا ہے۔

عیسائی دنیا ہر اسلامی جذبہ اور خواہش کا مذاق اڑاتی ہے، اور اسے ذلیل سمجھتی ہے۔ مشرق میں اہلِ یورپ اس شئے کو "تعصب" قرار دیتے ہیں جسے اپنے ملک میں وہ "قومیت" اور وطن پرستی سے تعبیر کرتے ہیں، اور جس صفت کو وہ مغرب میں "خودداری" اور "تمکنت" یا "قومی عزت" کہتے ہیں، اسی کو مشرق میں "جنگ جویانہ اسپرٹ" قرار دیتے ہیں۔ جس چیز کی نسبت اہلِ مغرب یہ گمان کرتے ہیں کہ "قومی جذبہ" ہے۔ اسی کو مشرق میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ "غیر ملکیوں کے خلاف جذبۂ حقارت" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

ان تمام امور سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تمام دنیائے اسلام کو وسیع دفاعی اتحاد میں متحد ہو جانا چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ اپنے تئیں تباہی سے بچانے کی خواہش مند ہو، اور ایسا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مغربی ترقی کے اصل اصول کو حاصل کرے اور یورپی طاقتوں کے رازوں کو معلوم کرے۔

جمال الدین پہلے شخص ہیں جنھوں نے حالیہ زمانے میں اتحادِ اسلامی کے خیال کو تازہ کیا...... وہ جہاں کہیں گئے۔ اپنے خیالات کے ہر نقوش چھوڑے ...... انھوں نے حالات کا اندازہ لگا کر نصرانی یورپ کے خطرے کے خلاف ٹھوس اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا...... مصر کی سیاسی آزادی کے سب سے پہلے علمبردار عربی پاشا، اسلام کی تمام موجودہ سیاسی بیداریوں نے بانیٔ اعظم علامہ سید جمال الدین ہی کے آفریدہ تھے جنھوں نے قریبًا تمام مشرقی ممالک پر اپنا اثر ڈالا...... لیکن انھوں نے مصر اور ایران پر بہت گہرا اثر ڈالا وہاں ان کی شخصیت اس انقلاب کے باوا آدم کی سی تھی جس نے دونوں ملکوں کو متاثر کیا...... مصر کے مفتیٔ اعظم محمد عبدہٗ، جن کی عظمت کے خود ان کے مخالف تک قائل ہیں۔ جمال الدین کے شاگردوں میں سے ہیں۔ شام کے نوجوان شاعر اور انقلابی ادیب اظہر، جنھوں نے عربی پاشا کی حمایت کی، اور جمال الدین کے جامعۂ ازہر کے خطبات کو اپنے مجلہ مصر میں شائع کیا تھا۔ ان کے شاگرد ہیں۔ ...... اس طرح ایک بے قرار سیاح، ایک جادو بیان مقرر کی زندگی کا دور ختم ہوتا ہے۔ جس کے علمی تبحر، صحیح تفکر، اور مذہبی تقدس نے جسے مشرقِ جدید کا سب سے پہلا مشعل دار بنایا۔

(مشرق میں تحریکِ قومیت کی تاریخ) ہانس کھان

یکتا مشرقی جمال الدین ایک بڑے شخص تھے، ان کی تعلیمات میں ایک خاص اثر اور کشش پائی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آخری ۳۰ سال میں دنیائے اسلام میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ہوا۔ میں اپنے تئیں بہت زیادہ مفتخر اور مشرف سمجھتا ہوں کہ وہ انگلستان میں میرے یہاں تین مہینے تک مقیم رہے۔ لیکن وہ اپنے خیالات کے پکے تھے۔ اور پورے طور پر ایشیائی تھے۔ اور آسانی کے ساتھ یورپین رسم و آداب سے مانوس نہیں ہوتے تھے۔

ویلفرڈ بلنٹ (گارڈن خرطوم)

ترکی اور جمال الدین تعلیم کا انحطاط میرے خیال میں تمام اسلامی ممالک میں عام تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں مذہب اسلام میں تجدید و اصلاح کی کوششیں شروع ہوئیں اور سنوسی، وہابی، بابی فرقے پیدا ہوئے۔ مگر وہ شخص جس نے سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ قدیم تعلیم کو کس حد تک مسلمانوں کے زوال میں دخل ہے، شیخ جمال الدین افغانی تھا۔ وہ افغانستان میں مدتوں تک سختیاں جھیلنے اور مصیبتیں اٹھانے کے بعد اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے ترکی آیا اور آتے ہی اس نے اہل علم کو متوجہ کر لیا۔ اس کی کوشش سے تعلیمی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی اور حکومت نے اسے مجلس تعلیم کا رکن مقرر کر دیا۔ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے مجمعوں میں تقریریں کیا کرتا تھا۔ ترکی علماء کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ شیخ الاسلام فہمی افندی نے اس کی تعلیم کو شریعت اسلامی کے خلاف قرار دیا۔ ۱۸۷۰ء میں شیخ جمال الدین نے پیغمبروں کی معاشرتی فرائض کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس نے مخالفت کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ شیخ ترکی سے مصر چلا گیا اور علماء اپنے مدرسوں میں وہی پرانے سبق رٹاتے رہے۔

خالدہ ادیب (ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش)

افغانی کا پیام "سید جمال الدین افغانی ملتِ اسلامی کی نشاۃ الثانیہ کے سب سے پہلے علمبردار تھے۔ اس پستی اور مایوسی کے دور میں ایک ایسے عالمِ باعمل کا پیدا ہونا جس کی نظیر زمانے کی رفتار کو دیکھتی اور سمجھتی تھی۔ جس کا دل جوش اور ولولے، عزم اور استقلال سے معمور تھا۔ جس کی زبان و قلم میں سحرِ حلال کا اثر تھا جس کے دست و بازو میں جہدِ حیات کی قوت تھی، اس بات کی علامت ہے کہ اسلام کے خاکستر میں ابھی زندگی کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ جو ہوا پاتے ہی بھڑک اٹھیں گی۔ اور مسلمانوں کے جہل و تعصب اور غیروں کے ظلم و استبداد دونوں کے انبار میں آگ لگا کر چھوڑ دیں گی۔ جمال الدین کا پیکرِ خیالی ہم افسردگان سے پکار پکار کر کہتا ہے ؎

آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما　　　　حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل

غرض جمال الدین کی سیرت وہ پیامِ امید ہے جسے ہر مسلمان کے کانوں تک پہنچانا اربابِ خبر پر فرض ہے۔"

سیّد عابد حسین استاد جامعہ ملیہ

فتنۂ فرنگ اور افغانی "یہ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کی عیسائی حکومتوں کو ان کی جوع الارض نے خوفناک درندوں اور بھیڑیوں کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔ جو اپنے خونی پنجوں سے دولِ اسلام کو چیرتے اور پھاڑتے ہیں۔ گو ان میں باہمی رقابتوں کی وجہ سے کتنا ہی اختلاف ہو، مگر دنیائے اسلام کے مقابلے میں سب کے سب ایک ہو جاتے ہیں، اور الکفر ملۃ واحدۃ کی بموجب تصویر اتحاد بن جاتے ہیں۔

سید جمال الدین نے اپنی دوربین نگاہوں سے اس مصیبتِ عظمیٰ اور داہیۂ کبریٰ کو دیکھ لیا تھا۔ جو امتِ اسلامیہ کے انتشار و اختلاف اور سفید رنگ

مسیحی اقوام کے اتحاد و اتفاق کی وجہ سے دنیائے اسلام پر نازل ہونے والا تھا۔ اس فتنۂ عمیا سے مسلمانوں کو بچانے اور ان کو خیرِ امت ۱ خرجت للناس بنانے کے لئے انھوں نے اپنی تمام زندگی وقف کردی۔

عبدالحی استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ

از ابرار حسن صاحب فاروقی ایم۔ اے

پان اسلامزم یا اتحادِ اسلامیّت

پان اسلامزم اور اس کے علمبرداران "پان اسلامزم" جس پر یورپ کے مبصرین اور منتقدین نے مجلدات لکھ ڈالے اور جس کی چھان بین کے لئے مغربی سیاحوں نے تمام ممالک اسلامیہ کی خاک چھانی حتیٰ کہ سرزمین حرم محترم میں بھی مسلمان بن کر پہنچے۔ یہ سب کچھ کیوں تھا۔ اُس راز کی عقدہ کشائی مقصود تھی جس پر اتحاد اسلامیہ کی بنیاد تھی۔ مگر وہ اس بات سے ناآشنا تھے کہ اسلام سازش اور خفیہ تحریکوں کا اس حد تک قلع قمع کر چکا تھا کہ فردِ اسلام سازش سے متنفر تھا اور ہے۔ تاریخیں اور واقعات شاہد ہیں کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی سازش یا کوئی خفیہ تحریک نہیں ہوئی۔ جو یورپ کا نصب العین چلا آرہا ہے۔

بہرحال اس مغربی دوادش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم میں کمزوریاں اور خرابیاں رونما ہونے لگیں۔ مرکزیت فنا ہونے لگی۔ آپس میں بیگانگی کے آثار ظاہر ہونے لگے "چین و عرب، ہندوستان۔ سارا جہاں" صرف شاعر کے دماغ میں "وطن ہمارا" رہ گیا تھا۔ کیونکہ غلام ساز قوموں نے ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ہماری جوگت بنائی۔ اس کے لئے صرف یہی کہہ دینا کافی ہے "صورت بہ بیں حالم مپرس۔"

عرب کا علمبردار اٹھارھویں صدی میں اس مغربی دوادوش اور مسلمانوں کی انحطاطی حالت کو دیکھ کر علامہ شیخ عبدالوہاب نجدیؒ نے اٹھارھویں صدی عیسوی میں "اتحاد اسلامی" اصلاحی بنیاد عرب میں ڈال کر اس کا حصہ دار نجد کو کیا۔ اور "وہابیت" یا بالفاظ انگریزی "وہابی ازم" کا دائمی لقب نجدی قوم کو دلوایا۔ یہاں میں نام نہاد "وہابیت" سے بحث کرنی نہیں چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ موضوع میرے مسئلہ زیر بحث سے ایک حد تک خارج ہے۔ بہر حال یہ تحریک بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے عمومیت کا درجہ نہ لے سکی اور نجد کی سرزمین میں نظر بند ہو گئی۔

شمالی افریقہ کا علمبردار تحریک انیسویں صدی میں انیسویں صدی میں علامہ امام محمد بن سنوسیؒ باشندۂ الجزائر نے جنھوں نے مسلمانوں کی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ مغربی سیاسی چالوں کا بھی اچھی طرح سے مطالعہ کیا تھا۔ ترک وطن کر کے طرابلس میں جو اس وقت ترکوں کی زیر حکومت تھا اقامت اختیار فرمائی لیکن بعض وجوہ سے طرابلس کو چھوڑ کر اندرون علاقہ کے طرف چلے گئے اور صحرائی آبادی کے مقام جوف میں اقامت گزین ہو کر اس تحریک کی تجدید کی۔ تجدید کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ حضرت امامؒ نے اس کو شروع کرنے سے قبل بلاد اسلامیہ کا دورہ فرمایا۔ حجاز و نجد بھی تشریف لے گئے۔ اور شیخ عبدالوہابؒ سے تبادلۂ خیالات فرمایا۔ غرض کہ اس تحریک کا نام "سنوسیت" یا "سنوسی ازم" رکھدیا گیا۔ یہ تحریک بھی اگرچہ عملاً عمومیت کا مرتبہ حاصل نہ کر سکی لیکن پھر بھی "نقش ثانی" ہونے کی وجہ سے اس کا عملی پہلو "وہابیت" کے مقابلے میں زیادہ روشن اور بارآور ثابت ہوا۔ مگر چونکہ یہ بھی افریقہ کے ان "زاویوں" اور "خانقاہوں" ہی تک محدود رہی جو اپنی مرکزی خانقاہ جوف سے متعلق تھیں۔

لہذا اس کا عملی ورم نسبتاً آگے نہ بڑھ سکا۔ لیکن یہ "سنوسیت" کی "اتحادی" تحریک کا ہی طفیل ہے کہ اٹلی باوجود کافی طاقت اور معقول سنہ کے، آج تک طرابلس پر پورا قبضہ نہ کرسکا۔ بلکہ ترکوں کی شیرازہ بندی اسی مبارک "سنوسیت" کی رہین منت ہے جس نے یونان کی غاصبانہ اور بزدلانہ جنگ کے دوران میں اناطولیہ میں حقیقی "اتحاد اسلام" کی روح پھونک دی تھی اور جس نے "عنزة شمشیر"[1] جیسے قوی دشمنان "جماعت نوجوان ترک" کی عداوت اور نفرت کو محبت اور اخوت میں بدل دیا۔ غرض کہ یہ دونوں تحریکیں اپنے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اختلاط بھی لائیں اور اس طرح عمومیت سے خصوصیت کی طرف منتقل ہو کر نجد کے گلزاروں اور شمالی افریقہ کے صحراؤں میں نظر بند ہو گئیں ہیں۔ لے خصوصیت کو اختلاط کے ہم معنی اس لئے کہا کہ "اتحادِ اسلامی" کا مقصد عمومیت کا احاطہ ہے نہ کہ خصوصیت کا۔ اب جب کہ عمومیت نے خصوصیت کی جگہ لے لی تو یقیناً مقصد فوت ہوا اور یہی اختلاط ہے۔

افغان کا علمبردار تحریکِ انیسویں صدی کے آخر میں غرض کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اوائل کے پان اسلامزم "وہابیت" اور "سنوسیت" کا لقب حاصل کر کے نجد اور شمالی افریقہ کے صحرائی حصہ میں زندگی بسر کرنے لگی کہ اسی عرصہ میں تیسرا علمبردار افغانستان کے ایک گمنام قصبہ "اسدآباد" سے اٹھتا ہے اور اس

---

[1] یہ دونوں قبائل اندرون اناطولیہ میں آباد ہیں اور تمام قبائل ممتاز درجہ رکھتے ہیں ۱۹۲۰ء میں جب کہ حکومتِ ترکی اپنے آخری سانس لے رہی تھی اُس وقت امام احمد بن محمد بن سنوسی دامت فیوضہٗ اناطولیہ پہنچے۔ یہ دونوں قبائل ترکوں کے جانی دشمن تھے جس کی وجہ سے انگورہ کی تحریک بے جان تھی۔ ممدوح نے اُن میں پہنچ کر ان دونوں کو رام کیا اور "قومی تحریک" کا مدد و معاون بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قبائل ہم آہنگ ہو گئے۔ الاخبار مصر۔ مارچ ۱۹۲۱ء۔

سسکتی ہوئی تحریک میں ایسی جان ڈال دیتا ہے جس سے ایک طرف منادیانِ "ہل من مزید" نعرہ اٹھتے ہیں۔ تو دوسری طرف مسلمان بادشاہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے کانپ اٹھتے ہیں۔

چونکہ "پان اسلامزم" کا نام اسی علمبردار کے کارناموں کا رہین منت ہے لہذا نفس تحریک پر تبصرہ کرنے سے قبل میں ضروری سمجھتا ہوں کہ "اسدآباد" کے شیر کا ناظرین سے تعارف کرا دوں۔

سید جمال الدین افغانیؒ انیسویں صدی کے بطلِ حریت کا نام سید جمال الدین افغانیؒ بقول بعض قصبہ "اسدآباد" متصل "کنار" صوبہ کابل میں پیدا ہوئے اور بقول بعض دیگر "اسدآباد" متصل "ہمدان" (فارس) میں پیدا ہوئے۔ میں اختلاف مولد کو خارج از موضوع سمجھ کر اس سے قطع نظر کرتا ہوں۔

سیدؒ کی تاریخ پیدائش اور تعلیم سیدؒ، "اسدآباد" میں ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام سید صفدر تھا جو سید علی الترمذی محدثؒ کی اولاد میں سے تھے بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ کابل دارالسلطنت افغانستان میں چلے آئے تھے۔ جب آٹھ سال کے ہوئے تو باپ نے تعلیم اپنی نگرانی میں دینی شروع کی حتیٰ کہ اٹھارہ برس کی عمر میں درسیات سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ہندوستان تشریف لے آئے۔ ایک سال کے قیام کے بعد وہ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں فریضہ حج ادا کر کے پھر اپنے وطن مالوف کو واپس آ گئے۔

سیدؒ اور وزارتِ کابل سیدؒ حج سے واپسی پر امیر دوست محمد خاں فرمانروائے کابل کی ملازمت میں داخل ہو گئے ۱۸۶۴ء میں دوست محمد خاں کا انتقال ہو گیا اور شیر علی خاں تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو بمصالح حکمرانی

گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن وہ سب اپنے اپنے صوبوں میں بھاگ گئے اور جنگی تیاری شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ شیر علی کو ہزیمت ہوئی۔ محمد اعظم مع اپنے بھتیجے امیر عبدالرحمٰن خاں (مرحوم امیر کابل) کے غالب آیا اور دارالسلطنت پر قبضہ کرکے عبدالرحمٰن کے والد محمد افضل خاں کو زندانِ غزنی سے نکالا اور تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ محمد افضل خاں ایک سال کی حکمرانی کے بعد مرگیا۔ محمد اعظم اس کے بجائے تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ چونکہ سیدؒ اس طوائف الملوکی اور شورشغب کے دوران میں محمد اعظم کا ہمدرد اور مشیر رہا۔ لہٰذا اس نے تخت نشین ہوتے ہی سیدؒ کو اپنا وزیرِ اعظم مقرر کرلیا۔

کابل میں پھر قتل و خون اور سیدؒ کا ترکِ وطن امیر شیر علی بھاگ کر قندھار میں پناہ گزین ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اُس پر قبضہ کر بیٹھا۔ اسی دوران میں محمد اعظم کے بیٹے نے اپنے چچا امیر شیر علی پر حملہ کردیا۔ امیر شیر علی کے سالار فوج محمد یعقوب خاں نے مقابلہ کرکے اُس کو گرفتار کرلیا۔ اس جنگ اور کامیابی نے امیر شیر علی کے اور حوصلے بڑھا دیئے۔ اور اب اس نے جنگ زیادہ زور سے شروع کردی۔ اس لئے کہ انگریز نہایت فراخدلی سے اُس کو مالی امداد دے رہے تھے۔" اس جنگ میں امیر شیر علی کو فتح ہوئی۔ محمد اعظم بھاگ کر نیشاپور اور عبدالرحمٰن بخارا چلے گئے۔ شیر علی پھر تختِ سلطنت پر متمکن ہوگیا۔ سیدؒ اس خونی ڈرامے کے بعد کچھ عرصہ تک اور کابل میں رہے۔ لیکن اس کے بعد بغرضِ حج بیت اللہ روانہ ہوکر ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں ہندوستان آگئے۔ گویا یہ "امدادی جنگ" سیدؒ کے لئے محرک ہوئی کہ وہ "یورپین ہمدردی" کا مطالعہ کرکے تمام مسلمانوں کو اخوت، محبت، رواداری، سیاست اور حکومت کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں۔ حکومت ہند نے بڑی آؤبھگت سے ان کو لیا۔ مسلم رہنماؤں سے ملاقات کرائی۔ مگر اپنی نگرانی میں بغرض کہ

ایک مہینہ کی "مہمان نوازی" کے بعد "اپنے[1] جہاز میں سوار کرا کر سویز کی طرف روانہ کر دیا۔"

وادی النیل میں سیدؒ کا پہلی دفعہ ورود سرزمین نیل ایک عرصے سے مغربی جوع الارض کی شکار تھی۔ ہر نو آبادی پسند قوم نام نہاد تمدن اور تہذیب کے آڑ میں مصر پر اپنا جبروت قائم کرنے کی فکر میں تھی۔ اور اب تک ہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کو ہندوستان اور دوسری نو آبادیوں کی محافظت مصر پر قبضہ کے لئے مجبور کرتی تھی۔ فرانس کو اپنی نو آبادیاں محبوب تھیں۔ اس لئے مصر کی اُس کو ضرورت تھی۔ جرمنی اپنی نو آبادیوں کی طرف سے متفکر تھا۔ اس لئے مصر کا اس کے قبضے میں رہنا ازبس ضروری تھا۔ غرضکہ مغربی سیاسیات کا یہ فٹ بال "میچ" (مقابلہ) ایسا تو تھا ہی نہیں جو دوست اور دشمن دونوں کے لئے دلچسپ نہ ہوتا چنانچہ ہر قوم اور ہر شخص کی آنکھیں اس سیاسی کھیل کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اسی زمانے میں "پان اسلامزم" کا "ہیرو" سید جمال الدین افغانیؒ پہلی مرتبہ وہاں پہنچتا ہے۔ مصر کی مہمان نواز خصلت نے اس اجنبی لیکن ممتاز مہمان کا پرتپاک خیر مقدم کیا سیدؒ نے سرسری چہل روزہ قیام میں مصری دنیا پر اپنی غیر معمولی علمیت۔ اعلیٰ فضیلت اور بہترین سیاست کا سکہ بٹھا دیا اور اپنے تئیں حلقہ علما و سیاسین میں متعارف کرا کر امتیازی درجہ حاصل کیا۔ سیاسیات مصر کے سرسری مطالعہ کے بعد سیدؒ نے ضرورت سمجھی کہ اس کی مرکزی سیاست پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہئے تاکہ پھر اپنے اتحاد کی اسکیم کو پوری طاقت سے شروع کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ارادۂ حج ملتوی کیا اور براہ راست قسطنطنیہ روانہ ہو گئے۔

سید دار الخلافہ میں اور وہاں اُن کی آؤ بھگت مصر میں شہرت اور امتیاز

---

[1] انقلاب ایران ص ۶ مرتبہ و مصنفہ پروفیسر براؤن۔

حاصل کرنے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ اُن کی شہرت کی صدائے بازگشت قسطنطنیہ کے پہاڑوں سے نہ ٹکراتی۔ چنانچہ وہاں پہنچتے ہی سرکاری غیر سرکاری حلقوں سے

"اُسے آمدنت باعثِ آبادئ ما"

کی صدائیں آنے لگیں وزیراعظم علی پاشا مرحوم اور امرا، دار الخلافہ نے پرجوش، خوش آمدید کہا۔ سرکاری مہمان ہوئے علمی حلقوں میں اُن کے چرچے ہونے لگے ہر شخص ان کی قابلیت اور علمیت کا راگ الاپنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھ ماہ کے ہی قیام کے بعد "انجمن دانش" (ٹرکش اکیڈیمی) کے ممبر منتخب ہوگئے۔

شیخ الاسلام اور سیدؒ میں غلط فہمی یہ تقاضائے بشریت اور لازمۂ فطرت ہے کہ ایک فن یا علم کے چند عالم یا فن داں آپس میں ایک دوسرے کی ترقی مدارج پر اگر حسد نہیں تو رشک ضرور کرنے لگتے ہیں۔ جو آخر میں عناد، بغض و عداوت کے ہم معنی ہو جاتا ہے! اور بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ ایک پردیسی سب پر گوئے سبقت لے جائے۔ چنانچہ سیدؒ بھی اسی نام نہاد رشک کی زد میں آگئے اور شیخ الاسلام سے محض لفظی غلط فہمی پر ان بن ہوگئی۔ دار الفنون (یونیورسٹی) کے مدیر تحسین افندی نے سیدؒ سے درخواست کی کہ وہ طلبا، جامعہ کو کسی روز اپنی تقریر سے مستفید فرمائیں۔ سیدؒ اگرچہ ترکی زبان بخوبی جانتے تھے لیکن مزاولت نہ ہونے کی وجہ سے اُس زبان میں تقریر کرنے سے معذور تھے۔ چنانچہ اولاً یہی عذر انھوں نے کیا۔ لیکن بالآخر اصرار سے مجبور ہو کر انھوں نے ترکی میں تقریر لکھی وزرائے تعلیمات و داخلیہ کو دکھا دی۔ جس کو انھوں نے پسند و منظور کیا اور حاضرین جلسہ کو جس میں ممتاز اخبار نویس، علما، اور امرائے سلطنت بھی موجود تھے پڑھ کر سنا دی۔ اس تقریر نے سیدؒ کی عزت اور شہرت میں چار چاند لگا دیئے اور مرجع خلائق بنا دیا۔ حسن فہمی افندی شیخ الاسلام تھے۔ ایک پردیسی کا عروج کیونکر

بھلا معلوم ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس تقریر[۵۱] کو انھوں نے عقائدِ اسلامیہ کے خلاف قرار دیا اب
کیا تھا مملکت میں ایک شور برپا ہو گیا۔ فریقین کے طرفدار تحریروں اور تقریروں سے
ایک دوسرے کی مدافعت کرنے لگے۔ حکومت نے اس طوفان کے روکنے کی بہتر تدبیر
یہی سوچی کہ سید کو کچھ دنوں کے لئے قسطنطنیہ چھوڑ دینا چاہیے۔ تاکہ یہ بات کی شورش تو
ختم ہو۔ چنانچہ سیدؒ کو وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ سید پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں
نے نبوت کو اکتسابی فن قرار دیا۔ جو سراسر عقائدِ اسلامیہ کے خلاف ہے لیکن جہاں تک
سیدؒ کی تقریر اور اُن کے حالات سے پتہ چلتا ہے۔ سید کے اوپر یہ سراسر بہتان تھا
نہ اُن کا یہ عقیدہ تھا اور اُن کی تقریر میں نہ اس کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ
سید رشید رضا نے اپنے "المنار[۵۲]" میں مفتی محمدؒ عبدہٗ مرحوم کے حوالے سے اس واقعہ کو
نقل کرتے ہوئے اس کو قطعی بہتان قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اُسی رشک کا
نتیجہ تھا جو سیّدؒ کے عروج سے پیدا ہوا تھا۔

سیّدؒ دوبارہ مصر میں ایک سال کے اندر اندر ۱۸۷۱ء میں سیدؒ قسطنطنیہ سے مصر واپس

---

[۵۱] یہ پروفیسر ای۔ جی براؤن نے اپنے "انقلاب ایران" کے ص ۷ پر سید کی تقریر کا ملخص یہ دیا ہے۔
"اُسی طرح سے انسانی معاشرت کا جسم بھی مرکب ہے لیکن چونکہ جسم بغیر روح کے زندہ نہیں
رہ سکتا ہے لہٰذا اس جسم کی روح یا تو قوتِ نبوت ہو سکتی ہے یا قوتِ عقل و حکمت۔ اگرچہ یہ دونوں ایک
دوسرے سے ممتاز ہیں اس لئے کہ مقدم الذکر انعامِ الٰہی ہے جو کوشش سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ
خُدا اپنے اُن بندوں کے لئے مخصوص کرتا ہے جن کے لئے وہ چاہتا ہے لیکن مؤخر الذکر اکتسابی ہے
جو محنت اور پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ان دونوں میں مابہ الامتیاز ایک اور چیز بھی ہے یعنی نبی
معصوم ہوتا ہے اور غلطی نہیں کر سکتا۔ بخلاف فلسفی کے کہ وہ گمراہ بھی ہو سکتا ہے اور غلطیاں بھی کر سکتا ہے۔"
[۵۲] المنار جلد ششم ۱۸۹۵ء۔

آ گئے۔ اب کی بار مسلسل آٹھ سال قیام کیا۔ اس طویل قیام میں ایسے ایسے علمی جوہر دکھائے کہ بڑے بڑے علمائے وقت اُن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ سیدؒ کی یہ دوا دوش۔ یہ محنت اور یہ علمی اور اسلامی خدمت ایسی تو تھی ہی نہیں جس پر حریفوں کی نظریں نہ ہوتیں۔ چنانچہ بعض فقہائے مصر نے احیاءِ فلسفہ و حکمت کو ناجائز قرار دیکر سیدؒ پر لے دے شروع کر دی دوسری طرف لارڈ ویوین قونصل جنرل برطانیہ متعینہ مصر نے ان کی سیاسی مساعی کو مشتبہ قرار دے کر خدیو مصر توفیق پاشا کو اُن کے اخراج پر آمادہ کر دیا۔ چنانچہ وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیدؒ نے جس قدر مصر اور مصریوں کی خدمت کی جس کا وہ اب تک رہینِ منّت ہے، اس قدر کسی مملکت یا قوم کی نہیں کی۔

مصر اس وقت تک بالکل خوابِ غفلت میں پڑا ہوا تھا۔ علم کا دائرہ اس قدر محدود تھا کہ پڑھے لکھے انگلیوں پر گنے جاتے تھے۔ جن میں "سب[1] سے زیادہ ممتاز عبداللہ پاشا فخری۔ خیری پاشا۔ محمدؐ پاشا۔ مصطفیٰ پاشا ذہبی اور چند اور تھے۔ لیکن سیدؒ کی مساعی قابلِ شکریہ ہیں۔ جنھوں نے قابل نوجوان اہلِ قلم کی تعداد میں بسرعت اضافہ کیا۔"

سیدؒ کی ہندوستان کو پھر مراجعت سیدؒ ہندوستان میں پھر ۱۸۷۹ء میں واپس تشریف لے آئے۔ اور اب کی بار حیدر آباد دکن میں قیام کیا۔ اس قیام میں انھوں نے ایک کتاب "ردِّ نیچریت" فارسی زبان میں لکھی جو حیدر آباد ہی میں ۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی۔ اس کے سال بھر بعد ہی "مصری نوجوانوں" کی تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ مصر میدان کارزار بن گیا۔ عربی پاشا نے فوجی کمان سنبھالی۔ اسکندریہ پر

---

[1] انقلاب ایران ص ۸۔

گولہ باری شروع ہوئی۔ تل الکبیر پر جنگ ہوئی۔ برطانیہ نے مصر پر قبضہ جمایا۔ مصر میں یہ خلفشار شروع بھی نہ ہونے پایا کہ گورنمنٹ ہند نے سید کو دکن سے طلب کر کے کلکتہ میں نظر بند کر دیا اور اُس وقت چھوڑا جب مصر کا مطلع صاف ہو گیا۔

سیدؒ نے گویا اپنی زندگی کے چوالیس سال مشرقی سیاسیات کے مطالعہ میں گزارے جس میں انھوں نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں میں جتنی کمزوریاں رونما ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ وہ سب حریص و حریف اقوام کی پیدا کردہ ہیں جس کا واحد علاج یہ ہے کہ پہلے ان کی سیاسی چالوں کا مطالعہ اُن کے گھر میں جا کر کیا جائے پھر اُن کو اسلامی دنیا میں طشت از بام کر کے اُن کے سامنے "عملی اخوت واتحاد" کا نسخہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ اجازت ملتے ہی وہ سیاحتِ یورپ کی غرض سے کلکتہ سے براہ راست لندن روانہ ہو گئے۔ وہاں کچھ دنوں قیام اور مدبرین وقت سے تبادلۂ خیالات کر کے پیرس چلے آئے یہاں تین سال تک قیام کیا۔ اسی عرصے میں ان کے معتقد خاص اور مخلص دوست محمدؐ عبدہٗ مشہور مفتی مصر اپنے وطن سے جلا وطن ہو کر آ گئے تھے جن پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے ۱۸۸۲ء[1] کی قومی جنگ میں حصہ لیا تھا۔" ان دونوں نے اپنے قیام میں پیرس سے ایک سیاسی ہفتہ وار اخبار "عروۃ الوثقیٰ" جاری کیا چونکہ اس پرچہ کا واحد مقصد اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت تھا۔ جو مدبرین یورپ کے لئے سوہان روح تھا۔ لہٰذا اٹھارھویں[2] نمبر پر

---

[1] انقلاب ایران ص ۹۔

[2] پروفیسر ای۔ جی براؤن نے لکھا ہے کہ "آخری نمبر اس کا اٹھارھواں تھا۔ اس لئے کہ اس کے سخت حملوں اور بڑھتے ہوئے اثر سے پریشان ہو کر برطانیہ نے ایک طرف اس کا ہندوستان میں داخلہ بند کر دیا۔ اور دوسری طرف غالباً دوسرے ذرائع اختیار کئے جن سے اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ (انقلاب ایران ص ۱۰)

اس کا کسی نہ کسی طرح سے گلا گھونٹ دیا گیا اور اس طرح سے وہ پانچویں ہی مہینے میں ختم ہو گیا۔

سیدؒ روس کی سرزمین میں سیدؒ کا جب یہ مشغلہ ختم ہو گیا۔ تو انھوں نے پیرس چھوڑ دیا اور وہ ماسکو اور سینٹ پیٹرس برگ (اب پیٹرو گراڈ) کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب سیدؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں تھے۔ چنانچہ روس نے بھی اُن کو بہت آؤ بھگت سے لیا۔ زار کی مہمان ہوئے۔ وہاں سیدؒ چار سال تک مقیم رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے یہ زبردست اسلامی خدمت انجام دی کہ روسی مسلم رعایا کو قرآن اور دوسری مذہبی کتابوں کے چھپوانے کی زار سے اجازت دلوائی۔ ورنہ اس سے قبل مسلمانوں کو یہ حکم نہ تھا کہ اپنی مذہبی کتابوں کو شائع کریں۔ یہ عیسائی رواداری کی مشتے نمونہ مثال تھی۔

سیدؒ ایران میں سید کا شہرہ اب چار دانگ عالم میں بج رہا تھا۔ چنانچہ ناصر الدین شاہ قاچار شاہ ایران نے اشتیاقِ ملاقات ظاہر کیا۔ جس کو سید نے کچھ دنوں تک ٹالتے رہنے کے بعد منظور کر لیا اور ایران پہنچے۔ ایران کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سید کو قدرت نے اس لئے پیدا کیا تھا کہ اقوامِ اسلام کی اصلاح اور بہبود کے لئے اسباب پیدا کریں۔ چنانچہ انھوں نے وہاں بھی اس کی بنیاد ڈالی۔ لیکن خالص شاہی سرزمین بھلا اس کی کیونکر روادار ہو سکتی تھی لہذا اپنے ممتاز مہمان کے درپئے آزار ہو گئی۔ سیدؒ نے جب یہ دیکھا تو وہ طہران سے روانہ ہو کر "شاہ عبد الاعظم" چلے گئے۔ جو طہران سے چند میل کے فاصلے پر ہے اور اس مزار پر معتکف ہو گئے۔ سید کے اس چندروزہ قیام نے لوگوں کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ لوگ جوق جوق اُن کے پاس وہاں پہنچنے لگے۔ شاہ کو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ لہذا اس نے پانچ سو سوار بھیج کر گرفتار کرایا اور ترکی حدود میں پہنچا دیا جس وقت ان کو گرفتار کیا گیا۔ اس وقت یہ صاحب فراش تھے۔ مگر اس کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا۔ بلکہ مزید براں اسی حالت میں ان کو اس طرح گھسیٹا گیا کہ اُن کے

کپڑے بھی پھٹ گئے"[۱]۔ شاہ کا یہ طرزِ عمل کسی کو پسند نہیں آیا بلکہ لوگوں کے دلوں میں شاہ کی طرف سے بغض و عناد و انتقام کی آگ بھڑکنے لگی جو آخر کار[۲] ۱۸۹۶ء میں اس اُس کے قتل سے بجھی۔

سید پھر قسطنطنیہ میں اور وفات وہاں سے اخراج کے بعد سید ۱۸۹۲ء میں پھر قسطنطنیہ آئے سے خلیفہ سلطان عبد الحمید خاں مرحوم نے ان کو مہمان رکھا اور ان کے لئے شاہی وثیقہ مقرر کر دیا۔ آپ نے پانچ سال مسلسل یہاں قیام کیا قیام کے چھٹے سال ۱۸۹۷ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اور "قبرستان شیوخ" (شیخلر مزار لیغی) میں مدفون ہوئے۔

غرض کہ "مجدد اتحاد اسلامیت" اپنی عمر کے ۶۰ سال پورے کرنے کے بعد اسلام اور مسلمانوں پر نثار ہو گیا اور دنیا میں اپنا کام اور نام چھوڑ گیا۔ آج جو کچھ نام نہاد اتحادِ اسلامیت کو الاپا جا رہا ہے وہ سید ہی کی ان تھک مساعی کا طفیل ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس مجدد کا کوئی قائم مقام ایسا نہ پیدا ہوا جو اس کے بعد اس سیاسی اور مذہبی تگ و دو کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آج نہ توریف کا یہ حال ہوتا اور نہ شام کا یہ حشر بنتا۔ بلکہ "اسلامی برادری" ایک سلک میں ایسی منسلک ہو جاتی کہ مادی قوتوں پر ناز کرنے والی اقوام بجائے حرصِ نو آبادی کے دوستی کا ہاتھ آگے بڑھاتیں۔ حتیٰ کہ "رنگین اقوام" کی "بغاوت، غداری، بربریت اور نا اہلی" کے الفاظ لغات میں بھی نہ ملتے۔

---

[۱] انقلاب ایران ص ۷۰۔

[۲] انقلاب ایران ص ۵۹۔

جامعہ ملیہ کے ایک استاد کے قلم سے

عالمِ اسلام اور جمال الدین افغانیؒ

تمہید ارجن کو خطاب کرتے وقت سری کشن جی نے بنی نوع انسان کے طبقہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے مراد ایسے اشخاص ہیں جو خوف و طمع کے بندے نہیں ہوتے اور جن کا واحد مقصد اللہ کی مخلوق کو بہتر راستے پر چلانا ہوتا ہے۔ سید جمال الدین افغانی یقیناً اس زمرے میں شامل ہونے کے مستحق ہیں۔ ان کی بے باکی، صداقت شعاری اور غربت اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انھوں نے حق کی حمایت میں بادشاہوں تک کی پروانہ کی، اور اگرچہ انھیں دولتمند بن جانے کے ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں مواقع حاصل تھے۔ مگر انھوں نے ہمیشہ غربت ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ وہ دنیائے اسلام کو اخلاقی، معاشرتی، ذہنی اور سیاسی اعتبار سے بہتر بنانے کے خواہشمند تھے۔ اور اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں جو کچھ ان سے بن پڑا اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے کیا۔ اور مرتے وقت وہ یقیناً اپنے جی میں خوش ہوں گے کہ ان کی زندگی اکارت نہیں گئی۔

سید جمال الدین اپنے دور کے بہترین عالم تھے۔ اور اگرچہ انھیں ہم سے جدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، تاہم ان میں اور کچھ عرصہ پیشتر کے علمائے ہندوستان میں ایک نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔ سید کا علمائے ہندوستان کے ساتھ

تقابل کرنے سے میں ہندی علمار کی شان کے خلاف کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میں صرف واقعات کا لحاظ کرتے ہوئے اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگرچہ علامہ موصوف نے بقول بلنٹ کسی زبردست درسگاہ میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ اور نہ ابتداء میں انھیں روشن خیال لوگوں کی صحبت میسر آئی، تاہم انھوں نے درس و مطالعہ اور غور و فکر کرکے دنیائے اسلام کے امراض کی نبض شناسی کی اور اپنی ساری عمر عزیز خدمتِ اسلام میں صرف کی۔ انھوں نے تاہل کی زندگی بسر نہیں کی۔ اس لئے کہ وہ اٹلی کے ہیرو بیزنی کی طرح اپنی قوم اور مذہب سے شادی کر چکے تھے۔

عالمِ اسلام جو زمانہ سید جمال الدین نے پایا تھا۔ وہ اس لحاظ سے دنیائے اسلام کی تاریخ میں اہم سمجھا جائے گا کہ اس وقت سارے عالمِ اسلام میں قعرِ انحطاط سے نکلنے اور ترقی کی جانب بڑھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں وہ لوگ جو ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کی تعلیمی، اخلاقی اور مذہبی پستی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے تھے، اور دہلی، لکھنؤ، اور دیگر مقامات میں بہ یک گردشِ چرخِ نیلوفری" امیروں کو غریب ہوتے دیکھ چکے تھے، غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندی مسلمانوں کی ترقی صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ جدید تعلیم کے ہتھیار سے مسلح ہو جائیں۔ ایران میں محمدؐ علی باب نے بھی اپنے ملک کی حالتِ زار کی نجات مذہبی اور اخلاقی اصلاح میں پائی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جدوجہد کا دائرہ اسی جانب مبذول رکھا۔ اور سرسیدؒ کی طرح ملک کی سیاسیات سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ مصر میں شیخ محمدؐ عبدہ اور دیگر اکابرِ قوم تعلیمی انقلاب کے ذریعے مصر کی نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور اگرچہ مہدی کی "بغاوت" اس زمانے کی پالیسی اور واقعات کا ضروری تتمہ تھے۔ تاہم ایک حد تک اس تعلیمی اور اخلاقی انقلاب سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ جو ملک میں رونما ہو رہا تھا۔ ترکی بھی

اس وقت حالت انقلاب میں سے گزر رہا تھا۔ اور چونکہ وہ گزشتہ چار پانچ سو سال سے یورپ اور اس کی تہذیب سے متاثر ہو رہا تھا، اس لئے مدحت پاشا اور دیگر مصلحین ملک نے اپنے وطن کی نجات مادی ترقی میں سمجھی۔ اسی غرض سے انھوں نے سڑکوں، ریلوں، اسپتالوں، اور مدرسوں وغیرہ کی تعمیر میں اپنی قوتوں اور ملکی ذرائعِ آمدنی کو صرف کیا، اور لباس اور ظاہری وضع قطع میں انھوں نے یورپ کو اپنا رہنما بنایا۔

اس وقت ہندوستان کی طرح ایران، مصر اور ترکی میں مولویوں کا بیحد زور تھا۔ اور چونکہ اس گروہ نے زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی اور نہ زمانے کی ہوا پہچانی تھی۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ملک میں مصلحین اور ان کے درمیان آویزش ہوئی۔ مصلحین کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے گئے، اور معاشرتی طور پر ان کا بائی کاٹ کیا گیا۔ مگر ترقی کا کام ان مخالفانہ کارروائیوں سے نہ رک سکتا ہے نہ آج تک کبھی رکا ہے۔ یہی مجادلے جاری تھے کہ سید جمال الدین اسٹیج پر آئے۔ وہ ہندوستان، افغانستان، ایران، ٹرکی، عرب، مصر، فرانس، انگلستان، روس اور دیگر حصص دنیا کی سیاحت کر چکے تھے، اور ہر ملک کے مسلمانوں کی ضرورتوں اور ان کے زوال کے اسباب پر کافی غور و فکر کر چکے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ اگر ایک طرف مسلمان جہالت میں غرق ہیں اور موجودہ دنیا کے اسباب ترقی سے بالکل نابلد ہیں تو دوسری طرف وہ اپنی نادانیوں کے باعث یورپین اقوام کی طمع اور جوع الارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس لئے انھوں نے بجائے تعلیمی اور اخلاقی اصلاح کرنے کے سب سے اول اس امر کو ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو اس امر کا احساس کرایا جائے کہ وہ بے حد کمزور ہیں۔ اور جدید آلات مدافعت میں بالکل غیر مسلح ہیں۔ اور اگر چندے یہی حالت رہی تو یورپین اقوام انھیں اپنا غلام بنالیں گی، اور پھر

اپنی انفرادی ہستی ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھیں گے۔

عالمگیر اتحاد اسلام اسی وجہ سے انھوں نے اسلامی ممالک کو بچانے کی کوشش کی اور یہ خیال کیا کہ جب وہ یورپ کی دستبرد سے بچ جاویں گی تو اندرونی اصلاحیں بعد میں خود بخود کر لیں گی۔ اتحاد اسلام کے لئے کام کرنے کا جذبہ ان کے وسیع مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر دنیائے اسلام ان کی صدا پر لبیک کہتی، اور ان کی تہدید پر بروقت عمل کرتی تو بہت سے اسلامی ممالک آج اغیار کی دستبرد سے محفوظ نظر آتے۔ اور مسلمانوں کو ان دردانگیز مظالم کا نشانہ نہ بننا پڑتا جن کی وجہ سے ان کے قلوب آج چھلنی ہو رہے ہیں۔ سرسید اور دیگر مصلحین نے صرف اپنے اپنے ملک کو بچانے کا خیال کیا، مگر یہ سعادت سید جمال الدین کے حصے میں تھی کہ وہ تمام دنیائے اسلام کی نجات اور ہوا خواہی کی مبارک آواز بلند کریں۔ اور یہی وہ بات ہے جس کی وجہ سے انھیں اپنے زمانے کے دیگر مصلحین پر فوقیت حاصل ہے اور رہے گی۔

گفتم میانِ عابد و عالم چہ فرق بود   تا اختیار کردی ازاں ایں طریق را

گفت او گلیم خویش بروں می برد ز موج   ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

سید چونکہ ہندوستان میں کم رہے۔ اس لئے ان کی تعلیمات کا اثر یہاں کے مسلمانوں پر بہت زیادہ نہیں پڑا۔ البتہ ایران میں انھوں نے کھلم کھلا حکومت کی خرابیوں کو ظاہر کیا۔ اور لوگوں کو بھی خود ان کی کمزوریوں سے آگاہ کیا۔ مرزا محمد علی خاں بن ذکاء الملک اپنی کتاب "دور مختصر تاریخ ایران" میں ایران پر سید جمال الدین کے اثر کے متعلق رقمطراز ہیں:-

"و حجۃ الاسلام محترم آقائی آقا سید عبداللہ بہبہانی، و آقای آقا میر سید محمد طباطبائی دامن ہمت بر کمر زدند، و با دولت سخت بنائے گفتگو گذاشتند و مردم ہم دور ایشاں جمع شدند، و بدگوئی از

اشخاص ظالم وشکایت ازخرابی کارہا زیاد شد۔ وحتی بالائے منبر
بعضی از واعظین دانا کہ مقدم الیشان آقا سید جمال الدین است،
معایب کارہا گفتند، ومردم را از بدبختی خود شاں خبردار کردند"۔[1]

سیداور بیداری ایران یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ علمائے ایران نے ہمیشہ سید کے ساتھ اشتراکِ عمل جاری رکھا۔ اس اتحادِ عمل کی بیّن مثال وہ شورش ہے جو علمائے ایران اور سید کی سرکردگی میں تمباکو کے ٹھیکے کے متعلق کی گئی تھی۔ اس اجارہ کی کیفیت "کشفِ تلبیس" میں یوں بیان کی گئی ہے:-

"ناصرالدین شاہ درسال ۱۳۰۷ (۱۸۹۰ میلادی) انحصار کل خرید و فروش توتون را بہ یک شرکت انگلیسی بربع عایدات سالیانۂ آں کہ تقریباً دو میلون مارک (قریب پنج کروڑ تومان) می شد فروخت۔ بواسطۂ یک فتوای از طرف مجتہدین درسال ۱۳۰۸ (۱۸۹۱) تمام تجار توتون فروش دکاکین خود را بستہ، وملت نیز دیگر بہ ہیچ وجہ توتون استعمال توتون نہ نمود، بطوریکہ در اندک زمانے تجارت توتون بکلی خوابید، بالآخر ناصرالدین شاہ مجبور شد کہ قرارداد انحصار را فسخ نماید، واین ممکن نہ بود، مگر بعد از ادا ئ یک وجہ خارقی معادل دہ ملیون مارک (قریب پنج کرور تومان) بشرکتِ لندن مذکور ایں مبلغ را از قرار تنزیل صدی شش قرض کردند، و پرداختند۔ وایں قرض یک ارث بسیار ناگواری برائ مظفرالدین شاہ ماند کہ از پدرش باو

---

[1] مطبوعہ مظفری پریس، بمبئی ۱۳۲۹ھ، طبع ثانی۔

منتقل گردید۔"[51]

بہرحال خواہ ٹھیکے کو کسی سیاسی جد و جہد کا بہانہ سمجھا جائے۔ یا خواہ اسے سیاسی بیداری کی ابتدا قرار دی جائے، اتنا یقینی ہے کہ ملک نے اسے قطعاً ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، اور علمائے اسلام کی آواز پر پورے جوش و اتفاق کے ساتھ لبیک کہا۔ کہتے ہیں کہ اس شورش کا اثر اس قدر عام تھا کہ تمام ملک نے تمباکو کا استعمال یک لخت چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن جب ناصرالدین شاہ نے اپنے خادم سے حقہ بھرنے کے لئے کہا تو اس نے مولویوں کے فتوے کی بنا پر تمباکو کو ہاتھ لگانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس وقت کہیں جا کر شاہ کو معلوم ہوا کہ ملک میں تمباکو کے اجارے کے بارے میں کس قدر شورش برپا ہے۔ ایران کی جدید سیاسی زندگی کی ابتدا اسی واقعہ سے ہوتی ہے۔ اور اگرچہ ایران اس وقت بھی غیر ملکی قرضوں کے بار سے دب چکا تھا، تاہم "آب از سر نرفت" والا معاملہ تھا، اور اس لئے بہت جلد اسے اپنی اقتصادی غلامی کا احساس ہو گیا۔ اس احساس بیداری کے پیدا کرنے کا سہرا ایک بڑی حد تک سید جمال الدین کے سر ہے۔

اصلاح کی صورت ایران کی طرح ترکی اور مصر میں بھی ان کا اثر دیرپا رہا، اور موجودہ واقعات اس امر کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ سید جمال الدین کی تعلیم میں اب برگ و بار پیدا ہو رہے ہیں۔ سید یورپین تہذیب و تمدن کے اختیار کر لینے میں اسلام کی نجات نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کی ندرت کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ انھوں نے جہاں جہاں تبلیغ کی وہاں کے علمار کو اسلام کی عام صورت حالات پر نظرثانی کی ضرورت جتلائی اور بتایا کہ ماضی کو پوجنے کے بجائے علوم جدیدہ کے ساتھ

---

[51] کشفِ تلبیس (از انتشارات ادارہ کاوہ۔ برلین) صفحات ۵ و ۶۔

ساتھ آگے کی جانب ترقی کرنی چاہئے۔ وہ قرآن و حدیث سے کماحقہ آگاہ تھے اور
یہی سبب ہے کہ ان کی تعلیم یہ تھی کہ مذہب اسلام ہر قسم کی روشن خیالانہ اور آزادانہ
ترقیوں اور تحریکوں کے بار کو اٹھانے کی قابلیت رکھتا ہے اور یہ کہ وہ کسی ذہنی
تبدیلی یا کسی خاص علم کے خلاف نہیں ہے۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ اسلام انسانی روح
کے لطیف ترین جذبات واحساسات کے لئے اطمینان اور شانتی کا سامان بہم پہنچا
سکتا ہے اور یہ کہ وہ موجودہ زندگی کی ضرورتوں کے عین مطابق ہے۔ انھوں نے
جمہور مسلمانوں کے دلوں کو تعصب اور تنگ دلی کے زنگ سے پاک کیا، اور سکھایا
کہ اسلام کوئی مردہ چیز نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر زمانے کی انسانی ضرورتوں کے
ساتھ مطابقت کرنے کا مادہ موجود ہے۔ اس تعلیم کو دیکھو اور اس زمانے کے مولویوں
کی کفربازی سے اس کا مقابلہ کرو تو عظیم الشان فرق نظر آئے گا مسٹر آسکیون بلنٹ کا
یہ کہنا بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ "یہ امر تعجب خیز ہے کہ اسلام میں بیداری اور مغربی
طریقے کی سی تحقیق وتدقیق کا پھیلانے والا وہ شخص ہے جو وسطِ ایشیا کی ترقی نہ کرنے
والی زمین میں پیدا ہوا۔ اور جس کی تعلیم وتربیت بھی اسی سرزمین میں ہوئی۔"

متاعِ دنیا اوپر کہا جا چکا ہے کہ سید کو مالدار بننے یا دنیا کی دولت جمع کرنے
کے بہت سے مواقع حاصل تھے۔ شاہ ناصر الدین نے انھیں پرمنفعت عہدے
پیش کیے، لیکن ان کی آزاد پسندی نے انھیں قبول نہ کیا۔ سلطان عبدالحمید خاں
سے بھی ان کے تعلقات دوستانہ تھے، اور اگر وہ چاہتے تو اس کی تحریکوں کے لیڈر
بن کر اس کا نام چمکاتے! ابوالہدیٰ کی طرح سلطان کی غاشیہ برداری کرتے۔ لیکن
دولت وطاقت ان کے لئے کوئی خوفناک شئے نہ تھی! انھوں نے سلطان عبدالحمید
اور شاہ ناصر الدین جیسے مستبد بادشاہوں کے خلاف کامیابی کے ساتھ صدائے
احتجاج بلند کرکے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا کہ اسلام شخصی اقتدار یا

استبداد کو روا نہیں رکھتا، بلکہ اس کا رجحان الیسی جمہوریت کی جانب ہے۔ جہاں ہر مسلمان کو حاکمِ وقت کے روبرو جرأت و آزادی کے ساتھ اپنے خیالات پیش کرنے کی عام اجازت حاصل ہے۔ اور جس میں کوئی شخص اس وقت تک حاکم نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ رعایا کا خادم نہ ہو۔ اور جس کا ہر فعل اور قول قانون کے مطابق نہ ہو[1] آج ہمارے علما سید جمال الدین کے نقشِ قدم پر چلیں تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔

عام اخلاق اور کارنامے سید جمال الدین جو مصر و یورپ میں افغانی شیخ کے لقب سے مشہور رہیں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ نہایت زبردست اور عجیب و غریب شخص تھے۔ ان کے ذریعے اکثر اسلامی ممالک میں اتحادِ اسلام کے جذبات پھیلے اور جہاں تک ان کی زندگی کے حالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ عظیم الشان کام ہے جسے انھوں نے تمام عمر اپنا مطمحِ نظر سمجھا۔ جہاں جہاں وہ گئے، وہ اپنے آئیڈیل سے غافل نہیں رہے۔ وہ فرقہ بندی، ذات پات اور ملک و قوم کے تباہ کن قیود سے بالاتر تھے۔ سنی، شیعہ کے تفرقوں کو انھوں نے ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا، اور انھیں اسلام کی وسیع تعلیم کے منافی قرار دیا۔ وہ خود اتحادِ اسلام کے مجسمہ تھے، ایسا اتحادِ اسلام جو مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دے اور انھیں پھر اسلام کی ابتدائی اور سادہ تعلیم پر عمل پیرا کر دے۔

دنیائے اسلام کے موجودہ واقعات اس امر پر شاہد ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کے مرض کا صحیح علاج دریافت کر لیا تھا۔ اور فروع پر وقت صرف کرنے کے بجائے انھوں نے ہمیشہ جڑ کو مضبوط کرنے کی فکر رکھی۔ افغانستان، ایران ہندوستان، مصر اور ترکی میں انھوں نے بہت سے نمایاں کام انجام دیئے لندن

---

[1] انگریزی قبضۂ مصر کی خفیہ تاریخ مصنفہ بلنٹ، مطبوعہ لندن ۱۹۰۷ء ص ۱۲۵۔

پیرس، پٹروگراڈ، میں وہ سیاسیات میں مشغول رہے۔ ان کی شخصیت نہایت زوردار تھی۔ وہ نہایت بارعب آدمی تھے۔ ان کی تحریر و تقریر دلوں میں اثر پیدا کرتی تھی وہ فی الحقیقت بڑے آدمی تھے اور لوگوں کے قلوب پر حکومت کرتے تھے۔

ان کی آنکھوں میں مقناطیسی قوت تھی۔ اور ان کی زبردست ایمانی قوت کے بعد اگر کوئی بزرگ ترین اور قابل احترام شئے ان میں تھی تو وہ ان کی قوتِ بیان تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے خطبوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ہر مباحثہ اور لکچر یا گفتگو کے وقت ان کی نظر لوگوں کے قلوب پر پڑتی تھی۔ ان کی قوتِ بیان اور بلاغت ہمیشہ غالب رہا کرتی تھی عربی تحریر نہایت زوردار اور شستہ ہوتی تھی فارسی لکھتے اور عام بول چال میں بالعموم افغانی محاورات اور لہجہ کا تتبع کرتے تھے۔ ان کی فارسی تحریروں سے ان کے ایرانی ہونے میں قدرے شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ان کا سب سے بڑا خیال جس میں ہمیشہ منہمک رہتے تھے، اسلامی سرسبزی اور اتحاد اسلام تھا۔ اسی کو وہ اسلام کی ترقی اور احیائے ملت کی بنیاد قرار دیتے تھے! اسی میں وہ یورپ کے غلبہ اور تسلّط سے اسلام کی نجات مضمر سمجھتے تھے۔ ان کی ہر لحاظ سے ایک زبردست اور جاذب ہستی تھی۔ لوگ ان کی صحبت سے خوش ہوتے تھے۔ لیکن ان میں ایک حد تک تعلی کی عادت تھی۔ اور ذرا زود خشم بھی تھے۔ وہ اپنے دل میں جس امر کو حق خیال کرتے تھے۔ اسے کھلم کھلا اور بے محابا بیان کرتے تھے۔ اور آئندہ کے خطرات کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔ وہ کسی چیز سے متاثر ہو کر میدان عمل سے نہیں ہٹتے تھے، لیکن وہ ان معنوں میں جن معنوں میں اہل یورپ مدبر سمجھے جاتے ہیں۔ مدبر نہ تھے، اور یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں وہ گئے، انھوں نے لوگوں کو اپنا حاسد اور دشمن بنا لیا۔ مگر ان کے دوست اور

مریدان کے سچے نام لیوا اور عاشق تھے، اور وہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے، اور انھیں اسلام کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔

جن وحشیانہ سختیوں کے ساتھ ان کا اخراج عمل میں آیا تھا! وجس بے رحمانہ طریقہ سے حکومت کے سپاہی ان کی ٹانگوں کو باندھ کر جاڑے کے موسم میں خانقین تک لے گئے تھے۔ اس کا اثر بدآخر عمر تک ان کے دل پر رہا اور، اور باوجود اس کے کہ اس تاریخ سے پیشتر وہ نہایت چاق وتندرست تھے لیکن اس واقعہ کے بعد جب وہ لندن پہنچے ہیں، تو نہایت لاغر اور علیل ہو گئے تھے۔

ان کی عمر کا سب سے بڑا کام مصر میں انجام دیا گیا تھا۔ جہاں تقریباً ۹ سال تک لوگوں کو ان کی ذات سے فیض پہنچتا رہا۔ مصر کے مشہور و معروف مفتی محمد عبدہٗ اور بہت سے علما و فضلا اور مہدی سوڈانی کے اکثر اصحاب شاگرد تھے۔ عربی، فارسی، ہمدانی، ترکی اور اسلامبولی (عثمان لوجہ) میں وہ خوب ماہر تھے۔ فرانسیسی زبان میں بقدر کفایت بات چیت کر لیتے تھے۔ اور فرانسیسی کتابوں اور رسائل کو زیر مطالعہ رکھتے تھے۔ انگریزی اور روسی جو ٹوٹی پھوٹی انھیں آتی تھی۔ اس کی وجہ لندن اور پیٹروگراڈ میں ان کا قیام تھا۔ شاید پشتو اور اردو بھی اتنی ہی آتی ہو گی کتب عربی و فارسی کو وہ بہت زیادہ پڑھتے تھے۔

اپنی تصنیف "تاریخ الافغان" میں مشہور فرانسیسی عالم لنورمان LENORMAN کے اقتباسات درج کئے ہیں۔ جو ثبوت ہے اس امر کا کہ وہ فرانسیسی کتب سے استفادہ حاصل کرنے کے عادی تھے۔

انھیں زندگی سے کچھ اعتنا نہ تھا، اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی مال و دولت جمع نہیں کی۔ طہران میں ایک مرتبہ ناصر الدین شاہ نے ہزار تومان اور ہیرے کی انگشتری ان کے پاس تحفۃً بھیجی تھی۔ انھوں نے روپیہ کو تو واپس کر دیا۔ مگر انگوٹھی کو

میزبان کے اصرار سے رکھ لیا اور اس کو بھی بالآخر اپنے میزبان کے صاحبزادے کو دے ڈالا۔ اسی طرح جب وہ مصر سے خارج کئے گئے تو سویز پہنچنے پر ان کی جیب بالکل خالی تھی۔ ایرانی سفیر نے انھیں قرضہ یا نذرانہ کے طور پر کچھ روپیہ دینا چاہا۔ مگر سیّد نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "شیر جہاں کہیں جائے گا۔ اپنے کھانے کا سامان خود مہیّا کر لے گا۔ سید جمال الدین ترقی و وجاہت پسند مسلمان تھے۔ اور انھیں اسلام سے سچّا عشق تھا۔ وہ اگرچہ کٹر مسلمان نہ تھے۔ تاہم وہ دین میں کسی انحراف کے پیرو نہ تھے۔ بطرس بستانی کے دائرۃ المعارف میں جو مضمون انھوں نے مذہب "باب" پر لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس فرقے کے متعلق ان کے خیالات ہمدردانہ نہ تھے۔

سید رشید رضا ایڈیٹر المنار
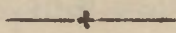
ایران کی اقتصادی غلامی اور جمال الدین افغانیؒ

سید جمال الدین نے ایران کے مجتہد اعظم کو جو خط تمبا کو کے اجارے کے بارے میں لکھا تھا۔ اس خط سے جید عالم کی جرأت اور جوش کا اندازہ ہو سکتا ہے، جن کا اہل ایران پر بہت گہرا روحانی اثر تھا۔ چنانچہ انھوں نے تمباکو کی کاشت اور استعمال کے متعلق امتناعی فتویٰ جاری کر دیا۔ علماء نے ان کے فتوے کی حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اور وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔ اور جمہور نے اس کے روبرو یہاں تک سر تسلیم خم کیا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ طہران میں فتویٰ کی نقل پہنچنے کے دوسرے دن صبح کو شاہ نے قلیان طلب کیا۔ مگر اس سے کہہ دیا گیا کہ محل میں تمباکو بالکل موجود نہیں ہے۔ اس لئے کہ ساری مقدار ضائع کر دی گئی ہے۔ اس نے متعجب ہو کر سبب دریافت کیا، اور اس کے جواب میں اسے حجۃ الاسلام کے فتوی کی اطلاع دیدی گئی۔ اور جب ملازمین سے پوچھا گیا کہ تم نے پہلے سے میری اجازت کیوں نہ لے لی۔ تو اسے جواب دیا گیا کہ یہ مذہبی معاملہ ہے جس کے متعلق ایسی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے بعد شاہ اجارہ کو منسوخ کرنے پر مجبور ہو گیا اس طرح سے

سید جمال الدین نے ایران کو انگریزی مقبوضہ ہونے سے بچا لیا۔ اور اصلی سبب کو زائل کر دینے سے انھوں نے نہ صرف اس اجارے کو بلکہ دوسرے اجاروں کو بھی جن کا ذکر اس خط میں ہے۔ منسوخ کرا دیا۔ ایسے ہی لوگ راستباز ہیں۔ اور ایسے ہی اشخاص سچے علما ہیں۔

اب (یہ مضمون ۱۹۰۸ء میں لکھا گیا تھا) علماء کے رسوخ کا اثر ایران میں پورے طور سے نمایاں ہے۔ اس لئے کہ اس نے نہ صرف نظام حکومت کو بدل دیا ہے بلکہ استبدادیت کو دستوریت میں مبدل کر دیا ہے۔ غالباً اس واقعہ سے علماء کو سب سے پہلے آگاہی ہوئی کہ وہ صورتِ حالات پر تمام و کمال قابض ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی سید جمال الدین ہی اس انقلاب کے اصلی بانی کہے جائیں گے۔ جس طرح سے وہ مصری انقلاب کے بانی تھے، جہاں ان کی پارٹی کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ اسماعیل پاشا کی حکومت کو تباہ و برباد کر دیا جائے! اور توفیق پاشا میں ترقی کی اسپرٹ پیدا کر دی جائے! اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے سید اور ان کے رفقا کو یہ یقین دلا دیا کہ اگر "میں تخت پر متمکن ہوا تو نمایندگان قوم کے لئے چیمبر قائم کروں گا اور دیگر اصلاحات بھی عمل میں لاؤں گا"۔ لیکن بعد میں فوج کی سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے تمام تجویزیں خاک میں مل گئیں۔

لیکن علما کو جو کامیابی (جس میں سید کی کوشش اور رہنمائی شامل حال تھی) ایران میں غیر ملکی مداخلت کے روکنے میں حاصل ہوئی۔ اس نے صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ علماء اور جمہور کی طاقت بادشاہوں کی طاقت سے زیادہ ہے۔ مگر اس آگاہی کی تکمیل شاہ کے قتل سے ہوئی! اور نیز اس روایت سے کہ قاتل سید جمال الدین کے مریدوں میں سے تھا۔

سید نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی کہ مجتہد اعظم اور دوسرے علماء کو شاہ اور

اس کے وزراء کی مخالفت کرنے پر آمادہ کیا، بلکہ وہ بصرہ سے یورپ گئے، اور اس کے خلاف تحریر و تقریر کے ذریعے جدوجہد شروع کر دی۔ انھوں نے وہاں "ضیاء الخافقین" رسالہ کی بنیاد ڈالی۔ جو انگریزی اور عربی زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اور جس کے ہر نمبر میں "سید" یا "حسینی سید" کے دستخط سے ایرانی معاملات پر ایک مضمون نکلتا تھا۔ مصر پر بھی جو مضامین اس میں شائع ہوئے تھے وہ بھی نہایت اہمیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ایران کے بارے میں جو مضامین وہ لکھتے تھے۔ ان میں سید شاہ اور اس کی حکومت کی خوب خبر لیتے۔ یہاں تک کہ سفیر ایران متعینہ لندن نے ان سے ملاقات کی اور انھیں اپنی طرف ملا لینے اور ان کے جوش کو ٹھنڈا کر دینے کی سعی کی تاکہ وہ تحریر و تقریر سے حملے کرنے سے باز آ جائیں۔ اور ساتھ ہی ایک معتد بہ رقم پیش کی۔ لیکن سیدؒ نے جواب میں کہا "میرے جوش کو صرف یہی بات فرو کر سکتی ہے کہ شاہ کو قتل کر دیا جائے اور اس کے پیٹ کو چیر پھاڑ ڈالا جائے! اور اس کی لاش کو سپرد خاک کر دیا جائے۔" سید کے اسی قول سے اس یقین کو اہمیت ہو گئی تھی کہ شاہ کا قاتل سیدؒ کا مرید تھا۔

از مولوی ابوالحسنات ندوی
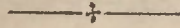
العُروۃ الوثقیٰ

گزشتہ پچاس برس سے عالم اسلامی بلکہ تمام مشرقی ممالک میں جو ایک حرکت
و بیداری سی پائی جاتی ہے اُس کے ابتدائی سلسلوں میں سب سے زیادہ اہم شخصیت
سید جمال الدین افغانی اسد آبادی کی ہے۔ وہ ایران سے اٹھے اور انھوں نے افغانستان
ہندوستان، مصر، عرب، قسطنطنیہ غرض اسلامی و مشرقی دنیا کے اکثر مقامات کا دورہ
کیا، ہر جگہ کے حالات دیکھے۔ وہاں کے ممتاز سربرآوردہ لوگوں سے ملے اور موقع
موقع سے قابل طبیعتوں کو اصلاح و بیداری کی طرف مائل کرتے رہے۔ گو سید جمال الدین
مرحوم تین مرتبہ ہندوستان بھی آئے، سب سے پہلی مرتبہ اپنے ایام تعلیم میں پشاور اور
لاہور تک مغربی علوم کی تعلیم کی غرض سے، دوسری مرتبہ افغانستان کے سیاسی انقلاب
کے بعد جب حج کی غرض سے مکہ معظمہ تشریف لے جانے لگے اور تیسری مرتبہ اس زمانہ
میں جب کہ مصر میں انگریزی اثر و نفوذ کے خلاف مصریوں نے عرابی پاشا کی زیرقیادت
اپنے حفظ آزادی کے ذرائع کو علانیہ کام میں لانا شروع کر دیا تھا، پہلی مرتبہ تو وہ
ایسی حالت میں آئے کہ خود اپنی ذات کی اہمیت اور اپنے شاندار مستقبل کی طرف سے
بے خبر تھے۔ دوسری مرتبہ کی آمد سے پہلے گو اُن کی سیاسی زندگی شروع ہو چکی تھی۔
لیکن اس کا دائرہ نہایت محدود تھا یعنی افغانستان کی داخلی سیاست تاہم ہوشمند

برطانوی حکومت نے اس وقت بھی یہاں ان کی کافی نگرانی کی، کم وبیش ایک مہینے سے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہ دیا، اور اُن کو کسی ہندوستانی سے برطانوی حاکم کی موجودگی کے بغیر ملنے کی اجازت نہ دی۔ اور تیسری مرتبہ جب وہ ہندوستان لائے گئے، تو ایک برطانوی سیاسی نظر بند کی حیثیت سے یہاں اُن کا داخلہ ہوا، اور کچھ دنوں حیدر آباد اور کلکتہ میں اسی حیثیت سے رکھے گئے، اسی وجہ سے ہندوستان ان سے بہت کم واقف ہوا۔ گزشتہ سات آٹھ سال سے بے شبہ کبھی کبھی زبانوں پر اُن کا نام آنے لگا ہے لیکن ان کی اہم شخصیت کے لحاظ سے ہم اس کو واقفیت نہیں کہہ سکتے، ان کی جادو اثر شخصیت کو دیکھنا ہو تو ہمیں ایران، مصر، شام اور قسطنطنیہ میں دیکھنا چاہئے۔ اُن کی وفات پر پچیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا، ہر ملک کی سیاست میں انقلاب ہو گیا، ہر جگہ کی آب وہوا بدل گئی، اور اب وہ زمین و آسمان نہیں رہے، جو آج سے پچیس سال پہلے تھے، تاہم سید جمال الدین افغانی کا نام مذکورہ بالا ممالک میں آج بھی اپنے اندر بجلی کا سا اثر رکھتا ہے۔

جب ۱۸۸۱ء میں مصر کا مسئلہ برطانوی شاہنشاہیت کے حسبِ مراد ختم ہوا۔ یعنی اُس کے اثر و نفوذ کا طوق مصر نے اپنے گلے میں ڈال لیا، اور عرابی پاشا کی جماعت ناکام رہی، تو سید جمال الدین کو بھی جو ہندوستان میں نظر بند تھے۔ نظر بندی سے رہائی ملی۔ اور ہندوستان کی برطانوی حکومت نے یہ اجازت دے دی کہ آپ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں، وہ یہاں سے براہِ راست لندن پہنچے اور وہاں چند دنوں رہنے کے بعد پیرس روانہ ہو گئے۔ اور وہیں سے رسالہ العروۃ الوثقیٰ عربی زبان میں شائع کرنا شروع کیا۔ ابھی اس کے صرف اٹھارہ ہی نمبر شائع ہوئے تھے کہ برطانوی ایوانِ حکومت میں زلزلہ پڑ گیا۔ برطانوی حکومت نے یہ محسوس کیا کہ اگر سید جمال الدین برابر اُس کو جاری رکھ سکے تو مشرق میں اس کی تمام آرزوئیں خاک میں مل جائیں گی۔

اس بنا پر وہ اس کی تباہی کے در پے ہوئی، اور سب سے پہلے ہندوستان، پھر مصر وغیرہ میں اس کے داخلہ و اشاعت کو ممنوع قرار دیا، ان بندشوں کے بعد سید صاحب مرحوم کے لئے العروۃ الوثقیٰ کو جاری رکھنا آسان نہ تھا، اور اگر بالفرض وہ جاری رکھتے بھی تو کم از کم مقاصد تو یقیناً حاصل نہ ہوتے، جن کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا تھا۔ اس لئے بالآخر سید صاحب نے رسالے کو بند ہی کر دیا چونکہ رسالہ نہایت پسندیدہ و مقبول تھا۔ اس لئے بعد کو مصر و شام میں اس کے منتخب مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہوئے لیکن ۱۳۲۸ھ میں حسین محی الدین الجبال صاحب جریدۂ ابابیل نے اس کو بہ تمام و کمال مطبع توفیق بیروت میں چھپوا کر شائع کیا۔ اور یہی مجموعہ اس وقت پیش نظر ہے۔

رسالہ کی ابتدا میں "ناشر" کی طرف سے ایک مختصر سا مقدمہ لکھا گیا ہے، جس میں محررین رسالہ کے اجمالی تذکرے بھی ہیں۔ سید جمال الدین مرحوم کے تذکرہ میں جو ان کی کتاب "الرد علی الدہریین" کے مقدمہ سے ماخوذ ہے یہ بتایا گیا ہے کہ "العروۃ الوثقیٰ" نام کوئی انجمن تھی جس کے ارکان و اعضاء نے سید صاحب سے ان کی آزادی کے بعد یہ خواہش کی تھی کہ وہ عالم اسلامی کو خطرات سے آگاہ کرنے اور باہم متحد ہونے کی دعوت دینے کے لئے رسالہ جاری کریں، چنانچہ سید صاحب نے ارکانِ انجمن کی اسی خواہش کے مطابق العروۃ الوثقیٰ کی بنیاد رکھی۔ اس کام میں سید صاحب مرحوم کے دو رفیق و مددگار تھے، ایک ان کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہٗ مصری اور دوسرے مرزا باقر ایرانی۔ مفتی محمد عبدہٗ تمام تر سید جمال الدین افغانی کے آغوش پروردہ تھے، خود مفتی صاحب کا بیان ہے کہ میں نے جب تک سید صاحب سے فیض نہیں اٹھایا۔ اُس وقت تک علم و فن کے صحیح ذوق سے نا آشنا تھا۔ ان کی صحبت میں آکر میری آنکھیں کھل گئیں۔" دوسری طرف سید صاحب کو بھی مفتی محمد عبدہٗ جیسے

شاگرد کے وجود پر ناز تھا، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "محمدؐ عبدہٗ مصر کے لئے ایک جنگی بیڑہ سے زیادہ قوی اور ایک لشکر سے بھی زیادہ بھاری ہیں"۔ جب سید صاحب مصر سے بحالتِ نظر بندی ہندوستان بھیجے گئے ہیں۔ تو سوئز میں انھوں نے اپنے دوستوں سے یہ فرمایا کہ "میں اپنے بعد مصر میں محمدؐہ کو چھوڑتا ہوں اور وہ مصر کے لئے بحیثیت ایک عالم اور رہنما کے بہت کافی ہیں"۔ واقعہ عرابی پاشا کے سلسلہ میں سید جمال الدین کی طرح مفتی محمدؐ عبدہٗ بھی مصر سے جلاوطن کئے گئے تھے وہ شام میں قیام پذیر تھے کہ سید صاحب مرحوم نے اُن کو پیرس میں اپنے پاس بلا لیا، اور "العروۃ الوثقیٰ" کی تحریر کی خدمت اُن کے سپرد کی۔

مرزا باقر ایران میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی، ہندوستان، چین، بُخارا، انگلستان، اٹلی اور فرانس کا سفر کیا۔ پھر بغداد اور عراق ہو کر لندن گئے، وہاں کچھ دنوں رہنے کے بعد بیروت (شام) پہنچے، یہاں انھوں نے شادی کی، اور کم و بیش تین برس کے قیام کے بعد کسی سیاسی سازش میں متہم ہونے کی بنا پر ترکی حکومت کے خوف سے طہران چلے آئے۔ اور وہیں انتقال کر گئے، مرزا باقر فلسفیانہ دل و دماغ رکھنے والے شخص تھے۔ عملی سیاست سے اُن کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ لیکن دُنیا کے جو واقعات اُن کی آنکھوں کے سامنے گزر رہے تھے ان کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس لئے دوسرے اکابر رجال عالم کی طرح وہ بھی دنیا کی بیچینیوں اور مصیبتوں کو دور کرنے کی تدبیریں سوچا کرتے تھے لیکن ان کی راہ سیاست نہ تھی۔ بلکہ ان کے نزدیک دنیا میں امن و آسائش کے قیام کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ تمام دنیا کے مذہبی اختلافات مٹا دیئے جائیں اور تمام دنیا کو ایک ایسے مذہب کی طرف دعوت دی جائے جو اُس کی موجودہ ترقی یافتہ حالت کے بالکل مطابق اور اس کی تمام معاشرتی و تمدنی ضروریات کا پورا

کرنے والا ہو، یہ مقصد بظاہر خواہ کسی قدر بلند اور شاندار معلوم ہوتا ہو۔ تاہم یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ موجودہ حالات میں وہ ایک ناممکن الحصول مقصد ہے، اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابھی مبارک زمانے کی آمد میں جب ساری دنیا اس قسم کی سادی سطح پر آجائے صدیوں کی دیر ہے۔

ہم اس موقع پر اُن کے حالاتِ زندگی کے متعلق اپنی طرف سے کچھ لکھنے کی بجائے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اُن کے شاگرد رشید مستشرق پروفیسر اڈورڈ براؤن کی اس چٹھی کا ترجمہ کر دیں جو انھوں نے مرزا باقر کے چھوٹے فرزند مرزا محمد ابن باقر مدیر مجلہ المنتقد کو لکھا تھا۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں :۔

میں یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ میرے استاد علامہ فاضل مرزا باقر مرحوم کے بیٹے ہیں۔ میں نے آغاز شباب میں جب مشرقی علوم والسنہ کی تحصیل کی طرف توجہ کی تھی، تو آپ کے والد محترم میرے سب سے پہلے استاد تھے، آج پچیس سال کا زمانہ گزر گیا کہ وہ مجھ سے الگ ہو کر بیروت کی طرف روانہ ہوئے تھے لیکن باوجود امتداد زمانہ اُن کے فضائل وخصائل حسنہ کی یاد اب تک میرے دل میں بالکل تازہ ہے۔ میری ان کی پہلی ملاقات ۱۸۸۲ء یا ۱۸۸۳ء میں ہوئی، میرا بہت زیادہ وقت اُن کی صحبت میں گزرتا تھا۔ میں نے اُن سے قرآن مجید کا درس لیا اور فارسی زبان میں خود ان کی منظوم تفسیر قرآن اُن سے پڑھی۔ اُن کی ایک اور منظوم تصنیف "شمسیہ لندنیہ" بھی میں نے اُن سے سبقاً سبقاً پڑھی۔ پہلی تصنیف لندن میں چھپ کر شائع ہوگئی ہے دوسری تصنیف اب تک شائع نہ ہوسکی لیکن جانے سے پہلے

انھوں نے مجھے اس کا ایک قلمی نسخہ مرحمت فرمایا تھا۔ اس کتاب کے اشعار غایت درجہ مشکل اور ناقابلِ فہم ہیں، کوئی شخص جبتک اس کے رموز و اشارات سے واقف نہ ہو، ایک شعر کا بھی مطلب نہیں سمجھ سکتا، میں اس لئے سمجھتا ہوں کہ میں نے مصنف مبرور سے اس کو سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔ اور اس کے ناقابل فہم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس میں ان واقعات و کیفیات کی طرف اشارے کرتے ہیں جو ان کو عالمِ مثال یا عالمِ خواب میں نظر آئے۔ نیز اکثر مقامات پر بطریق رمز و اشارہ اس زمانے کے سیاسی حالات کو بھی لکھ جاتے ہیں جو اس وقت پیش آ رہے تھے۔ اور اس سلسلے میں سلطنتوں کے وزراء اور وکلاء کے نام بھی لکھے جاتے ہیں لیکن نام صاف صاف نہیں لیتے۔ بلکہ عجیب طریقے سے ان کا ترجمہ کر دیتے ہیں کہ اُس کی طرف توجہ نہ دلائی جائے۔ کسی کا ذہن منتقل ہو ہی نہیں سکتا، مثلاً ایک شعر ہے۔

سنگ بہیجت، بہیج نام نیرزد   شنگ وہیجت بجنگ ننگ در آمد

یہ شعر واقعات سیاسیہ مصر سے متعلق ہے۔ "سنگ بہیج" سے ان کا مقصود "گلیڈ اسٹون" ہیں۔ جو اس زمانے میں جب برطانوی حکومت مصر پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے ساعی تھی انگلستان کے وزیر اعظم تھے، دوسرے مصرع میں "شنگ وہیج" سے مقصود "برائٹ" ہیں، یہ بھی اس وقت وزرائے انگلستان میں داخل تھے "سنگ بہیج" اور "سنگِ وہیج" اُن کے ناموں کا لفظی ترجمہ ہے۔ اسی طرح انھوں نے تمام ناموں کے تحت اللفظ ترجمے کئے ہیں،

اور ہر واقعے کو رمز بنا کر لکھا ہے، جس کا بطور خود سمجھنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

مرحوم کو علوم دینیہ والسنۂ قدیمہ وحدیثہ میں خاص درجہ حاصل تھا۔ وہ متعدد زبانوں مثلاً عبرانی، یونانی، انگریزی، عربی فارسی اور ہندوستانی کے عالم و ماہر تھے، بہت فصیح انگریزی بولتے تھے، اور اس میں ان کا طرز تحریر فلاسفہ و علماء کا طرز تحریر تھا۔ گفتگو بہت کرتے تھے، اور بہت تیزی کے ساتھ بولتے تھے! اثناء گفتگو میں ایک لمحہ کے لئے بھی چپ نہ ہوتے تھے، بسا اوقات کھانا میز پر رکھا رکھا ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ اور اُن کو گفتگو سے اتنی مہلت نہیں ملتی تھی کہ کھانا کھالیں۔ بہت بارعب بلکہ کسی حد تک خوفناک تھے، ان کے اہل وطن ایرانی عموماً ان سے ڈرتے تھے۔ اور تو اور خود پرنس ملکم خاں جو بیداریٔ ایران کے موسسین میں سے تھے اور اس وقت انگلستان میں ایران کے سفیر تھے وہ بھی اُن سے بے حد مرعوب تھے۔

گو یہ ضرور ہے کہ رسالہ ان تینوں بزرگوں کی سعی و محنت سے مرتب ہو کر شائع ہوتا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کے اصلی روحِ رواں سید جمال الدین تھے، رسالہ کے بنیادی خیالات اور سیاسی معتقدات تمام تر وہی ہیں جو سید صاحب مرحوم کے تھے۔ مفتی محمد عبدہٗ کا کام ان خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر تحریری صورت میں لانا تھا، اسی لئے رسالہ کے لوح پر سید جمال الدین افغانی کو رسالہ کا "مُدیرِ سیاست" اور "ذمہ دار مسلک" اور مفتی محمد عبدہٗ کو "مُحررِ اول" لکھا بھی گیا ہے، مرزا باقر مرحوم لندن میں رہتے تھے۔ اور وہیں سے عالمِ اسلامی کے متعلق ضروری اخبار و

مضامین کا انگریزی سے عربی میں ترجمہ کر کے پیرس دفتر "العروۃ الوثقیٰ" کو بھیجا کرتے تھے۔

ان ضروری تشریحات کے بعد اب ہم رسالہ کے مواد ترکیبی اور اس کے اہم مضامین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

رسالے کا مقصد آج سے پچاس ساٹھ برس بظاہر اکثر مشرقی ممالک کی یہ حالت نہیں تھی جو آج ہے۔ اس وقت مغربی فتوحات کا سیلاب ایسا طوفان خیز اور ہمہ گیر نہ تھا۔ جیسا کہ آج ہے، اس لئے اس وقت مشرق کی متعدد سلطنتیں آج سے بہت زیادہ بہتر حالت میں نظر آتی تھیں۔ گو یہ بالکل سچ ہے کہ اس وقت بھی تمام مشرقی قومیں یکساں ضعف و کمزوری کی حالت میں تھیں، اُن کا شیرازۂ تمدن بکھر چکا تھا، اُن کے زبردست اخلاق کا ستون مرکز ثقل سے ہٹ چکا تھا، اور ان کی قومی سلطنت و حکومت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ لیکن ان کمزوریوں پر گزشتہ طاقت و شوکت اور جاہ و جلال کا ایسا پردہ پڑا ہوا تھا کہ ان کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ نشۂ ماضی کی سرمستیوں میں اس درجہ چور تھیں کہ خمار حال کی اعضا شکن تکلیفوں کا اُن کو احساس تک نہ تھا۔ سید جمال الدین افغانی کا اصلی کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت وہ سب کچھ دیکھ لیا تھا جو بہتوں کو آج بھی نظر نہیں آتا۔ اُن کو علانیہ یہ نظر آرہا تھا کہ مشرقی قومیں غفلت و بیخبری کی حالت میں پڑی ہیں، اور چالاک مغربی قومیں آہستہ آہستہ ان کی دولت و ثروت، جاہ و حشمت، حکومت و سلطنت پر قبضہ کرتی جاتی ہیں۔ اُن کو ان کے نظام اخلاق، نظام معاشرت، نظام تمدن اور نظام سیاست کی کمزوریوں نے ایسی حالت میں کر دیا ہے، کہ وہ ایک دوسرے سے بے نیاز و بے خبر ہیں، اُن کی دینی، قومی اور سیاسی روابط بودے پڑ گئے ہیں، اور حملہ آور دشمن اُن کی اس حالت سے بتدریج فائدہ اٹھا کر ان کو اپنا زیر دست اور ماتحت بنا لینا چاہتا ہے، چنانچہ العروۃ الوثقیٰ کے پہلے نمبر میں جہاں رسالہ کی ضرورت اور اس کے

اغراض و مقاصد سے بحث کی ہے تحریر فرماتے ہیں:۔

عام طور پر مشرقی قوموں کی بربادی کی اب کوئی حد نہیں رہی، اور وہ انتہا درجہ تباہ حال ہو چکی ہیں خصوصاً مسلمان جن میں کے بہت سے تاجدار اپنے تاج و تخت اور بہت سے حکومت و ریاست کے حقدار اپنے حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔ اُن میں بے شمار صاحب جاہ و عزت تھے۔ جو ذلیل ہو گئے، بے شمار اربابِ شوکت و جلال تھے، جو حقیر ہو گئے، اور بے شمار اصحاب دولت و مال تھے، جو فقیر ہو گئے۔ کل تک جو صحیح و تندرست و توانا تھے، وہ آج مقیم و مریض ہیں اور جو شیر تھے وہ بھیڑیئے ہیں، ان کا کوئی فرقہ، کوئی طبقہ اور کوئی گروہ ایسا نہیں جو اس عام تباہی و بربادی سے محفوظ رہ گیا ہو۔

اس تمہید کے بعد کچھ اور آگے چل کر لکھتے ہیں،

ان آخری ایام میں مشرقی ممالک کے اہم مقامات میں جو یکساں مصیبتیں نازل ہوئی ہیں۔ ان کی وجہ سے ان کے تمام باشندوں میں باہمی ربط و اتحاد کی تجدید ہو گئی ہے، اور اس وقت مشرقی ممالک کے متفرق و مختلف اور دور دراز مقامات کے رہنے والے ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب و متحد ہو گئے ہیں، ہر جگہ کے ارباب فہم بیدار ہو چکے ہیں، اور موجودہ حالات کے نتائج پر غور کر رہے ہیں، وہ ان اسباب کی طرف بھی متوجہ ہو چکے ہیں، جنھوں نے ان کو موجودہ حالت تک پہنچا دیا ہے اور بقدر امکان ان کے رفع و ازالہ کی فکر بھی ان کو دامنگیر ہے۔ وہ اپنے

ربط واتحاد اور سعی و کوشش کی بنا پر اس کے امید وار ہیں کہ شاید کھوئی ہوئی شوکت و قوت کو ایک دفعہ پھر پالیں، اور موجودہ حوادث میں اُن کو اپنے دین و مذہب، شرف و وقار، اور ننگ و ناموس کی حفاظت و صیانت کا کوئی موقع ہاتھ آئے۔ وہ موجودہ وقت کو ایک مغتنم فرصت سمجھتے ہیں اور اسی سے ان کی امیدیں قائم ہیں ان کے دلوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کھٹکتا کہ بغیر کسی عمدہ نتیجے کے یہ وقت و موقع نکل جائے گا۔ لیکن فرض کر لو کہ یہ موقع ہاتھ سے بھی جاتا رہے تو پردۂ غیب سے اس قسم کے بیسیوں مواقع آئندہ اور پیدا ہو جائیں گے۔

اس وقت مختلف ممالک مشرقی بالخصوص بلاد ہند اور مصر میں اس مقصد جلیل کے حصول کے لئے متعدد جمعیتیں قائم ہو چکی ہیں، جو ہر ممکن طریقے سے ذرائع کامیابی کی تلاش و جستجو میں سرگرم و مصروف ہیں، نہ وہ سعی و عمل سے تھکتی ہیں، اور نہ اپنی کوششوں میں کوئی کمی کرتی ہیں۔ اگرچہ اس راہ میں ان کو ان تمام انتہائی خطرات سے دوچار ہونا پڑے جو انسانی زندگی کو پیش آ سکتے ہیں۔

اس قسم کی ایک طویل تمہید کے بعد آخر میں مقاصد رسالہ کی تشریح یوں کی ہے۔

یہ رسالہ بقدر امکان مشرقی قوموں کے لئے ان ضروری کاموں کو صاف صاف بیان کرے گا۔ جن میں کسی طرح بھی کمی کرنا ان کی بربادی، کمزوری اور تباہی کا سبب ہے، اور ان راستوں کی طرف علانیہ رہنمائی کرے گا۔ جن پر چلنا تلافی مافات کے لئے ازبس

ضروری ہے، نیز آئندہ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی بھی صورتیں پیش کرتا رہے گا۔

یہ رسالہ مشرق کے اعلیٰ طبقہ کی نگاہوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اور ان شبہوں اور وہموں کو دور کرے گا جن کی وجہ سے ہدایت و کامیابی کا راستہ ان پر ملتبس ہو گیا ہے، ان کے ان وسوسوں کو دفع کرے گا جن کی بنا پر وہ مرض کے علاج و شفا کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اور عام طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مصیبت اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے، اور تدارک و تلافی کا زمانہ گزر چکا۔

یہ رسالہ یہ سمجھائے گا کہ تمام مشرقی قوموں کے لئے تکافو یعنی باہمی امداد و اعانت کا طریقہ نہایت ضروری ہے۔ اور یہی ان کے سیاسی روابط اور وطنی تعلقات کا محافظ ہو سکتا ہے اسلئے کہ اسی طریقے کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ آج قوی نے ضعیف کو دبا لیا ہے۔

یہ رسالہ اعداءِ مشرق کی محبت و خیر خواہی کی اس منقش چادر کو جو رنگا رنگ ملاطفت و نرم خوئی سے رنگین ہے چاک کر کے جو کچھ پسِ پردہ ہے اس کو علانیہ دکھا دے گا اور حریص طماع مغربِ مشرق کی تاریکی غفلت میں آہستہ آہستہ جس مخفی راہ پر چل رہا ہے اس پر کافی روشنی ڈالے گا۔

یہ رسالہ اس کی خاص کوشش کرے گا کہ تمام مشرقی قوموں پر جو غلط الزامات قائم کئے جاتے ہیں۔ اور خاص کر

مسلمانوں پر جھوٹی تہمتیں لگا کر ان کو بدنام کیا جاتا ہے! ان کی اچھی طرح پردہ دری کرے۔ اور اصل حقیقت کو سمجھائے، نیز بعض ناواقفوں کے اس خیال کی تردید کرے گا جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان کبھی تمدن و ترقی کی برکات سے اس وقت تک مستفید نہیں ہو سکتے، جب تک وہ انھیں اصول پر کاربند رہیں گے جن پر آج سے سینکڑوں برس پہلے کاربند ہو کر ان کے اسلاف نے فائدہ اٹھایا تھا۔

یہ رسالہ تمام مشرقی قوموں کو سیاسی حوادثِ عامہ سے باخبر کرنے کی ہر وقت کوشش کرے گا۔ اور ان کے متعلق سیاسی جماعتیں جو طرزِ عمل اختیار کرتی رہیں گی۔ ان کے انکشاف اور پردہ دری سے غافل نہ ہوگا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مشرقی قوں کے باہمی تعلقات کی تقویت و استحکام اور ان کے افراد میں باہمی محبت و الفت کی تلقین و تمکین کی خاص طور پر رعایت رکھے گا۔ اور ان کے منافع مشترکہ کی تائید و حفاظت کو اپنا سب سے زیادہ ضروری فرض سمجھے گا۔

ان سادہ اور اجمالی مقاصد کو دیکھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ سید جمال الدین افغانی نے جن ضروریات کو پیش نظر رکھ کر یہ رسالہ جاری کیا وہ کیا تھے؟ کسی غافل جماعت کو حملہ آور دشمن کے حملہ سے محفوظ رکھنے اور اس کو اپنی آپ حفاظت کر سکنے کے قابل بنانے کی سب سے عمدہ اور بہترین صورت یہ ہے کہ ایک طرف اس کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا جائے۔ اور دوسری طرف یہ بتایا جائے کہ حملہ آور دشمن کس طرف سے، کس وقت اور کن اسباب و آلات جنگ سے

مسلح ہو کر اُس کو اپنے قابو میں کر لینا چاہتا ہے۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل سے معلوم ہوگا سید صاحب بالکل اسی اصول پر عمل پیرا تھے۔ ایک طرف تو وہ بار بار مشرقی قوموں کو ان قومی و وطنی فرائض کے ادا کرنے کے لئے آمادہ کرتے تھے۔ جن پر ان کی حیات قومی و وطنی کا مدار ہے، اور دوسری طرف مغربی قوموں کے وسائس و مکائد اور طرق فتح و غلبہ کی پردہ دری بھی کرتے جاتے تھے۔

اتحاد امم مشرقیہ لیکن ہم اس موقع پر جس چیز کی طرف ناظرین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ سید صاحب مرحوم مشرقی قوموں کے باہمی بغض و عداوت کو رفع کرنے اور ان میں ربط و اتحاد کو پیدا کرنے کو کس قدر ضروری خیال کرتے تھے، آج ہندوستان کے رہنماؤں نے مدت کے تجربہ اور ضرورت کی انتہائی حالت پیدا ہو جانے کے بعد یہ محسوس کیا ہے کہ آزادئ ملک کی تعمیر کے لئے ملک کی مختلف قوموں اور فرقوں کا پختہ اتحاد خشتِ اولین ہے۔ جس کے بغیر یہ عمارت قائم ہی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن سید جمال الدین نے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ہی اُس کو محسوس کیا اور بار بار اس کا اعلان کرتے رہے، مقاصد رسالہ کا ایک ایک حرف و جملہ اسی حقیقت کا اعلان کر رہا ہے، نیز مختلف مضامین میں سید صاحب نے اس کا خاص طور پر اعادہ کیا ہے۔ ایک موقع پر جب مصر کی مجلس وزراء نے مصر میں "العروۃ الوثقیٰ" کے داخلہ و اشاعت کو ممنوع قرار دیا، تو اس واقعہ پر نوٹ لکھتے ہوئے اس پختہ عقیدے کی بنا پر اپنے حسنِ ظن کو جن الفاظ میں ظاہر کیا ہے، ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

> مجلس نے مصر میں العروۃ الوثقیٰ کے داخلہ و اشاعت کو ممنوع قرار دیا، اور اسی فیصلے کے مطابق سرکاری اعلان میں ظاہر کیا گیا ہے کہ جس شخص کے پاس اس رسالہ کا کوئی نسخہ پایا جائیگا

اس کو پانچ سے لے کر پچیس گنی مصری تک بطور جرمانہ ادا کرنا ہوگا
ہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں قائم کر سکتے کہ کسی مصری
رکن کی با اختیار و آزاد رائے نے یہ فیصلہ کیا ہو۔ بلکہ ہم خدیو
مصر کی ذات سے بھی ایسی امید نہیں رکھتے، اور ہمارے وہم
میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ کوئی مصری خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر
مسلمان۔ بلکہ کوئی مشرقی جو مصر میں قیام پذیر ہو۔ اس حکم میں عدل و
انصاف کا شائبہ تک پاتا ہو۔ اور یہ کس طرح ہو سکتا ہے کیونکہ
اس رسالے نے مصری حقوق کی محافظت و مدافعت کے فرائض
ادا کئے ہیں۔ ہر معاملے میں مصریوں کی امداد و اعانت کی ہے۔
اور مصر کے دشمنوں کی امیدوں کو ناکام کرنے کی سعی و کوشش
کی ہے۔ اس رسالہ کا مشرب زید کی مدح اور عمرو کی عیب جوئی
نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد نہایت ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس کی
کوششیں اس پر صرف ہوتی ہیں کہ مشرقی قوموں کے سینوں
میں باہمی بغض و عداوت کے جو شعلے بھڑک رہے ہیں اُن پر
نصیحت و مصالحت کا پانی ڈال کر اُن کو اخلاص و محبت سے
بھر دے۔ وہ ابنائے مشرق سے یہ التماس کرتا ہے کہ باہمی
تنازع و اختلاف کے ہتھیار ڈال دیں اور اس عام مصیبت
کے مقابلے میں جو سب کے لئے یکساں تباہ کن ہوگی، اتحاد و
اتفاق کے اسلحہ سے مسلح ہو کر صف بستہ ہو جائیں، وہ یہ چاہتا ہے
کہ گھر کے آئندہ اندرونی انتظامات کی فکر سے پہلے خود گھر کی
حفاظت کرنا چاہئے۔ ابتدا سے "العروۃ الوثقیٰ" کا یہی طرز عمل ہے

پھر کیونکر ایک لمحے کے لئے بھی کوئی عاقل انسان یہ تصوّر کر سکتا ہے
کہ مشرق کا کوئی فرد خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ایک ایسے مفید رسالہ کو
اپنے ملک میں داخل ہونے سے روک دیگا۔ ہم یقینی طور پر یہ جانتے
ہیں کہ یہ سب اس قوت کا کرشمہ ہے جو اس وقت مصر پر مسلط ہے
اور وزارتِ مصر نے جو کچھ کیا ہے وہ انگریزی عمال حکومت کے
جبر اور دباؤ سے کیا ہے۔

العروۃ الوثقی کے اجراء کے زمانے میں مشرق کا اہم سیاسی مسئلہ "مصر میں
برطانوی مداخلت" کا مسئلہ تھا، اور اس پر بحث و تمحیص کے دوران میں لازمی طور پر
بار بار ترکوں اور مصریوں کا نام آتا تھا۔ اس سے ایک بدگمان شخص کے لئے یہ موقع
تھا کہ وہ یہ خیال قائم کر لے کہ "العروۃ الوثقی" خاص مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی
حفاظت و حصول کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ سید صاحب کو خود بھی یہ بات کھٹکی
تھی، چنانچہ اس کے دفعیہ کے لئے العروۃ الوثقی کے عنوان سے ایک نوٹ میں تحریر
فرماتے ہیں :-

کسی کو یہ خیال قائم نہ کرنا چاہئے کہ اس رسالے میں
جو بار بار خاص طور پر مسلمانوں کا تذکرہ آتا ہے تو اس سے مقصود
صرف انھی کے حقوق کی محافظت اور اُن کے غیر مسلم ہموطنوں کے
حقوق و مصالح کو جو صدیوں سے رشتۂ وطنیت کی بنا پر ان
میں باہم مشترک و مخلوط ہیں، نظرانداز کر دینا ہے! ایسا کرنا ہماری
افتادِ طبیعت و رجحان کے بالکل خلاف اور ہماری شان سے بہت
بعید ہے، کیونکہ ایسا کہنے کی اجازت نہ تو ہم کو ہمارے دین و مذہب
نے دی ہے اور نہ ہماری شریعت اس کو کسی حال میں بھی جائز

رکھتی ہے، ہماری غرض عام طور مشرقی قوموں کو ہشیار اور بیدار کرنا ہے
لیکن اثنائے تحریر میں جو ادھر بار بار مسلمانوں کا نام آتا ہے تو اس
کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس وقت جن ممالک پر اغیار نے دست درازی
کی ہے اور جن سر زمینوں میں دشمن گھس آئے ہیں وہاں مسلمانوں کی
غالب تعداد آباد ہے۔ اور وہاں اسلامی حکومتیں قائم ہیں اس لئے
خطاب کے موقع پر مسلمانوں کا نام آنا بالکل ناگزیر ہے۔

اتحاد دول اسلام اتحاد دول اسلام یا "اتحاد اسلامی" کے اولین داعی اس میں
شبہ نہیں کہ سید جمال الدین افغانی تھے۔ اور انھوں نے "العروۃ الوثقی" کے توسط سے
اس خیال کو مغرب سے مشرق اور جنوب سے شمال تک پھیلا دیا۔ اس کے فیصلے کا
یہ موقع نہیں کہ وہی دعوت اتحاد اسلامی ہے جس کے خوف سے یورپ کا جسم لرز
جاتا ہے، ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں چہرہ زرد پڑ جاتا ہے، اور خواب میں بھی ترکوں
کی بے نیام تلواریں چمکتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں یا کوئی اور؟ بلکہ یہاں صرف یہ بتانا
مقصود ہے کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو متحد کرنے اور ان کی باقیماندہ حکومتوں کو
رشتۂ اتحاد میں منسلک کرنے کے لئے یقیناً سید جمال الدین نے اپنی آواز بلند کی
تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ سید جمال الدین نے جب مسلمانوں کے ضعف و انحطاط اور تباہی و
بربادی کے اسباب وعلل پر غور کرنا شروع کیا تو اس کا سب سے پہلا اور اصلی
سبب ان کی رائے میں یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے وحدۃ کلمہ و اتحاد و اخوت کا سر رشتہ
جس سے ان کی حیات قومی اور عزت و عظمت وابستہ تھی شکستہ و پارہ پارہ ہے۔ اس
لئے انھوں نے سب سے پہلے اسی دھاگے میں گرہیں لگانے کی کوشش کی۔ اس
اجمال کی تفصیل غیر کی بجائے خود اُن کی زبان سے سننا زیادہ بہتر ہے! ایک مضمون میں
جس کا عنوان واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث

آثار سے اتحاد و اخوت کی تعلیم و ضرورت کا ثبوت دے کر یہ لکھا ہے کہ جس قوم کی مذہبی تعلیم یہ ہے! اس میں آج یہ انتہا درجہ تفرق و انتشار اور جدائی و علیحدگی کیوں پائی جاتی ہے؟ پھر اُس کی ایک فلسفیانہ اور واقعی و حقیقی توجیہ کرنے کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس کا خُلاصہ یہ ہے:-

اس صاف اور ظاہر اصول میں غور و فکر کرنے کے بعد تم کو اس کا سبب معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان اتحاد و اتفاق کی اس مذہبی تعلیم و تلقین کے باوجود کیوں ایک مدت سے اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو اُس کی طرف اقدام نہیں کرتے، حقیقت یہ ہے کہ ایک مدت سے ان دینی عقائد کے سوا جو عمل مشترک سے بالکل الگ ہیں اور کوئی چیز ان کے درمیان "جامعہ" باقی نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان میں باہمی تعارف تک نہیں ہے۔ اور وہ ایک دوسرے سے بہت بڑی طرح جُدا ہیں، اوروں کا تو کیا ذکر؟ خاص علمائے کرام جن کے فرائض میں عقائد کی حفاظت اور لوگوں کی ہدایت داخل ہے۔ آج ان کا یہ حال ہے کہ ان میں کوئی باہمی مواصلت و مراسلت نہیں، ترکی عالم، حجازی عالم کے حالات سے بالکل بے خبر، اور ہندی عالم، افغانی عالم سے قطعاً غافل ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک ملک کے علما باہم کوئی ارتباط و موصلت نہیں رکھتے۔

پھر جس طرح یہ بیگانگی و جدائی طبقۂ علما میں ہے ٹھیک اسی طرح اسلامی سلاطین و امرا میں بھی ہے۔ کیا یہ تعجب انگیز امر نہیں کہ عثمانی حکومت کی سفارت مراکش میں اور مراکشی حکومت کی

سفارت عثمانی حکومت میں نہیں ہے؟ کیا یہ نادر واقعہ نہیں ہے کہ
دولت عثمانیہ کا کوئی صحیح رابطہ افغانی امارت کے ساتھ نہیں پایا
جاتا؟ یہی تفریق و پراگندہ حالی ہے جس کی بنا پر آج یہ کہنا بالکل
صحیح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو دوسری جماعت اور
ایک شہر کے باشندوں کو دوسرے شہر کے باشندوں کے ساتھ
کوئی علاقہ و تعلق نہیں ہے، آج ان میں ایک ہلکی قسم کا صرف یہ
احساس باقی رہ گیا ہے کہ "ہاں فلاں ملک اور فلاں شہر میں بھی
کچھ لوگ ان کے ہم عقیدہ اور ہم مذہب رہتے ہیں۔"

ملتِ اسلامیہ ایک صحیح المزاج اور قوی البنیہ جسم کی طرح
تھی کہ دفعتاً اس پر مصیبتیں نازل ہوئیں اور اس کی قوت ضعف سے
صحت علالت سے اور اتحاد و التیام تفرق و انتشار سے بدل گیا
جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس کا سارا نظام جسمانی پاش پاش ہو گیا۔

ملتِ اسلامیہ کے روابط میں اس ضعف و اختلال کا آغاز اس وقت
ہوا۔ جب رتبۂ علمیت و تفقہ فی الدین رتبۂ خلافت سے جدا ہوا،
یعنی عباسی خلفاء، خلفائے راشدین کے طریقہ کے خلاف اجتہاد
و تفقہ فی الدین اور شرفِ علم و فضل سے بے بہرہ ہو کر محض نام
کی خلافت پر قانع ہو گئے۔ خلیفۂ وقت کی اس علمی و اجتہادی
بے مائگی و کمزوری نے عام مطلق العنانی کے لئے دروازہ کھول دیا
اور کثرت سے مذاہب مختلفہ پیدا ہو گئے، اور تیسری صدی ہجری
کے آغاز میں اسلامی فرقوں میں اختلاف و تعصب اپنی انتہائی حد تک
پہنچ گیا۔ اسلامی دنیا کے لئے یہ سب سے پہلی مصیبت تھی جس نے

اس میں تفرق وانتشار کی راہیں پیدا کی تھیں کہ دفعتاً اس مصیبت کے بعد ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ جو پہلی سے زیادہ مؤثر، زیادہ وسیع اور زیادہ تباہ کن تھی اور جس نے پہلی مصیبت کی پیدا کی ہوئی تباہیوں کو اور زیادہ عام اور ہمہ گیر کر دیا۔ یعنی یہ کہ اب خود منصب خلافت کی تقسیم و تجزی ہوگئی۔ اور بغداد کی خلافت عباسی کے علاوہ مصر و مغرب میں فاطمی خلافت۔ اور اندلس اور اطرافِ اندلس میں اموی خلافت قائم ہوگئی۔ اس تفرق کلمۂ امت و انشقاق و اختلاف امم اسلامیہ نے ایک طرف تو ان کے باہمی تعلقات کو کمزور کر دیا، اور دوسری طرف رتبۂ خلافت کے اثر و وقار کو کھو دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلوں سے منصب خلافت کی عظمت و ہیبت مٹ گئی۔ عین اسی زمانے میں حکومتُ سلطنت کے طالب و دعویدار اٹھے اور انھوں نے قوت و شوکت کے حصول کے لئے خلافت کی کسی قسم کی رعایت کئے بغیر ہر طرح کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ صحیح معنوں میں خلافت مٹ گئی اور سلطنتیں قائم ہوگئیں۔

ابھی دنیائے اسلام کو ان مصیبتوں کے بعد دم لینے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی کہ دفعتہً ایک تیسری مصیبت نازل ہوئی جو سب سے زیادہ برباد کن اور تباہی انگیز تھی، یعنی چنگیز خاں اور تیمور لنگ نے اٹھ کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کا شیرازۂ تمدن بکھیر دیا اور اس کی سلطنت و حکومت، شوکتِ اقتدار جاہ و جلال اور عزت و ثروت کا ایک ایک ورق اس طرح منتشر کر دیا کہ

پھر کبھی مجتمع و منظم نہ ہوسکا۔ اس مصیبت نے تمام اسلامی دنیا کو
حواس باختہ کردیا۔ اُس کے دامن اتحاد کا تار تار الگ ہوگیا اور
اتحاد و اتفاق و ربطِ ملی کی ایک گرہ کھل گئی، اور ساتھ ہی وہ تمام
عقائد و عوائد بھی کمزور یا فنا ہوگئے جو ان کو وحدۃ کلمہ کی دعوت
دیتے تھے اور باہمی اتحاد و ارتباط پر اُبھارتے تھے۔ ان حالات کا
نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس وحدۃ کلمہ و اتحاد بین المسلمین کو بالکل فراموش
کر گئے اور اُن کے با احساس سے با احساس اور بلند ترین طبقہ
میں بھی اگر اس کے متعلق کوئی خیال باقی رہ گیا تھا تو وہ ایک صورت
ذہنیہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا جو صرف خزانۂ خیال میں
پائی جاتی ہے اور اُس کو قوتِ حافظہ صرف اس حالت میں یاد
کر سکتی ہے۔ جب انسان اپنے خزانۂ معلومات کا باضابطہ جائزہ لے۔

مسلمانوں کا یہی تفرق و انتشار تھا جس کو ربط و اتحاد سے بدل دینے کی کوشش
سید جمال الدین افغانی مرحوم نے کی تھی۔

علماء کی طاقت کو حرکت میں لانا لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ
اہم اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سید صاحب نے علماء کی جماعت کو حرکت میں
لانے کی خاص کوشش کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں اس جماعت کی
حیثیت نہایت بلند و ارفع ہے اور وہ جسدِ اسلامی کے لئے بمنزلہ روح کے ہے۔
جس کے صلاح و فساد پر تمام نظام جسمانی کے فساد و صلاح کا دار و مدار ہے، سید
صاحب نے متعدد مضامین میں علماء کی طرف توجہ کی ہے اور اُن کو اُبھارا ہے لیکن
ہم بہ نظر اختصار ایک ہی کے ترجمہ و اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔ ایک مضمون کے آخر میں جس کا
عنوان وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

مسلمان کبھی ان فضائل سے کلیتہً جدا نہیں ہو سکتے جن کو
انھوں نے اسلاف سے وراثتہً پایا ہے۔ اور یہ بھی ایک واقعہ ہے
کہ ان کو کتاب اللہ، سنت نبویؐ اور اپنے دین و شریعت کے
ساتھ انتہائی حسن اعتقاد ہے، اور ہاں وہ خلفائے راشدین
صحابہ کرام اور سلف صالحین کی سیرتوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے
یہ چیزیں ان کے قلوب پر کالنقش علی الحجر ہو چکی ہیں لیکن موجودہ
وقت میں ان چیزوں کی طرف سے جو غفلت و بے پروائی ان میں
پائی جاتی ہے وہ بالکل سطحی اور عرضی ہے اس حالت کے لئے
بقا و دوام نہیں، ادنیٰ درجہ کی توجہ کی بھی ان کو اس خواب غفلت
سے بیدار کر سکتی ہے۔

جب تم قرآن مجید کی ان آیتوں کو غور سے دیکھو گے جن میں
بہترین فضائل اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے، اور پھر مسلمانوں کی اس حس
و دل بستگی پر غور کرو گے جو ان کو کتاب اللہ پر عمل سنت رسول اللہ کی
تقلید، اپنے دین و مذہب کے احترام اور رسولؐ اور اصحابؓ رسول
کی تعظیم و تجبیل کے ساتھ ہے تو تم خود بخود یہ فیصلہ کرنے پر مجبور
ہو گے کہ اگر علمائے دین اپنے ان وظائف و فرائض کے ادا کرنے پر
جو ان پر صاحب شرع کے وارث ہونے کی حیثیت سے عائد
ہوتے ہیں آمادہ ہو جائیں تو کوئی قوت نہیں۔ ہے جو امت اسلامیہ
کے احیاء، اور اس کے مجد و فضیلت کے اعادہ کی راہ میں رک بن سکے۔

بے شبہ علمائے راسخین فی العلم اور بالغ نظر مسلمان یہ
اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس زمانے میں جو کچھ مصیبتیں مسلمانوں پر

آئی ہیں۔ وہ اللہ کی طرف سے ان بے اعتدالیوں کی سزا ہیں۔ جو انھوں نے پچھلے دنوں میں کی ہیں، پس ہمیں علمائے کرام کی ہمت، ان کی غیرتِ دینی اور حمیّت ملّی سے امید ہے کہ وہ شگاف کے پھیلنے سے پہلے اُس کے جوڑنے اور مرض کے مستحکم ہونے سے پہلے اس کے علاج و مداواۃ کی طرف کافی توجہ کریں گے۔ ان کو چاہیئے کہ وہ عامۂ مسلمین کو احکام اللہ اور سنتِ نبویؐ کی پیروی پر ابھاریں اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ان کے باہمی رشتۂ اخوت و الفت کو مضبوط و مستحکم کرنے کی کوشش کریں نیز یہ کہ لوگوں کے قلوب پر جو یاس و ناامیدی چھا گئی ہے اس کے محو و فنا کرنے کے لئے اپنی تمام جدوجہد کام میں لائیں اور لوگوں کو یہ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونا انسانی قلب کی ایک بیماری اور اس کے عقائد کی کجی ہے جس سے مسلمان یقیناً ہر طرح پاک اور بے عیب ہیں۔

از علامہ عبدالقدوس ہاشمی

اتحاد اسلامی اور جمال الدینؒ

انیسویں صدی کا نصفِ آخر وہ پُر آشوب زمانہ تھا جب کہ مسلمان اپنی پستی کے آخری نقطۂ حضیض پر پہنچ چکے تھے۔ جاہ و جلال کے اعتبار سے دیکھئے تو ہندوستان کی عظیم الشان سلطنت کا برائے نام بادشاہ بھی ۱۸۵۷ء کے خونیں ہنگامے کے بعد رخصت ہو گیا تھا۔ کابل و افغانستان کی قسمت صدیوں سے ہندوستان کے ساتھ وابستہ تھی، اس لئے وہاں بھی انگریز شاطروں کی چالیں چل رہی تھیں۔ خاندان امارت کے افراد کو آپس میں لڑا لڑا کر بہادر افغانیوں کو تباہ کیا جا رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا خونیں ہنگامہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک آخری کوشش تھی۔ جو اپنے بعد از وقت شروع ہونے اور خود ہندوستانیوں کی غداری کی وجہ سے ناکام ہو چکی تھی۔ افغانستان میں چونکہ غیر مسلم نہ تھے اس لئے یہاں اس ہنگامے سے پہلے ہی ایک امارت بن گئی تھی اگرچہ اس امارت پر ہندوستان کے جدید فرماں رواؤں کی حریص نظریں لگی ہوئی تھیں۔ اور اس کی حیثیت ایک ماتحت ریاست سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ مگر افکار میں وہ ابھی تک ہندوستان کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ آزاد تھے۔

ایران کے فرق عزت پر کج کلاہی کانپ رہی تھی۔ انگریزی فوج کا ہراول سوداگروں کی شکل میں قبضہ جما چکا تھا۔ اور سلطنتی نظم و نسق میں اسے اتنا بڑا حصّہ مل چکا تھا کہ

اس کے خلاف دم مارنے کی سکت خود شاہ قاچار میں بھی موجود نہ تھی مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت بسلطنت عثمانیہ کا یہ حال تھا کہ یورپین مقبوضات میں اس کے خلاف جذبۂ وطنیت کو ترقی دے کر ان مقبوضات کو اس سے علیحدہ کیا جا رہا تھا۔ زار روس کی چیرہ دستیاں مغربی شمالی ایشیا میں مسلمانوں کو خود مسلمانوں سے جُدا کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ مسلمان قوم کو چھوٹے چھوٹے جغرافی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے غلام بنایا جا رہا تھا۔ افریقہ اور جنوبی مغربی ایشیا کے مسلمانوں کو "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" کا سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ بربریوں کو دوسرے مسلمانوں سے نسل کی بناء پر الگ کیا جا رہا تھا۔ مصریوں کو آستانہ کے خلاف بھڑکا کر جمعیتِ اسلامی کا شیرازہ بکھیرا جا رہا تھا۔ غرض یہ کہ وہ زہریلا پودا اسی زمانہ میں لگایا گیا جس نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۷ء میں تناور درخت بن کر اپنی زہریلی ہوا سے مسلمانوں کے جسم ہی نہیں بلکہ ہڈیوں تک کو زہر آلود کر دیا۔

جاہ و جلال کی تباہی لازمی طور پر قومی افکار اور اجتماعی قوت دماغ کی پستی ساتھ لاتی ہے۔ "اپنا سونا کھوٹا تو غیر کو دیجئے دوش"۔ کچھ ہمارے امرا کی بدستیاں کچھ اربابِ اقتدار کی تن آسانیاں اور سب سے بڑھ کر ان طبقات سے متاثر عامۃ المسلمین کی بے حسی نے قوم کو نہ صرف صنائع اور ایجادات کے میدان میں پیچھے ڈال دیا بلکہ دماغی مرعوبیت اور افکار کی غلامی کا ایسا جُوا ان کے گلے میں ڈالا جسے اب تک اتارا نہ جا سکا ہے۔ یاد رکھیئے کہ قومیں جسمانی طور پر آزاد ہونے سے پہلے دماغی طور پر آزاد ہوتی ہیں۔ ممکن نہیں کہ افکار کی غلامی موجود رہے۔ اور اعمال کی غلامی ختم ہو جائے۔ کوئی قوم جب آزادی، سربلندی اور عظمت کی طرف بڑھتی ہے۔ تو سب سے پہلے اس کے افکار میں اس کے خیالات میں اور اس کے جذبات میں آزادی اور حوصلہ مندی کی کرنیں دکھائی دیتی ہیں۔

ان حالات میں جن کا مختصر اور بہت ہی دھندلا خاکہ میں نے آپ کے سامنے کھینچا ہے۔ ایک مردِ حق بین حق آگاہ اور حق گو پیدا ہوتا ہے۔ میں اس کی بحث کر کے وہ کہاں پیدا ہوا اور کس خطۂ ارضی کو اس کا مسقط الراس ہونے کا فخر حاصل ہے اس کی پاک روح کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا۔ وہ اللہ کا ایک بندہ تھا۔ جو اسود و احمر، صفاہان و سمرقند اور عرب و عجم۔ کے قیود سے آزاد تھا۔ جس کے دماغ پر رموز و ظلمت اسرار حیاتِ قومی اور کائنات کا نظم و نسق روشن تھا۔ جس کی انگلیاں قوموں کی نبضیں دیکھتی تھیں۔ جس کے کان پچھلی اقوام کے افسانوں کے ساتھ ساتھ آئندہ آنیوالی اقوام کی آواز بھی سن سکتے تھے۔ خُدا اپنی رحمت نازل کرے اس روح پر جس نے مستقرؐ و متاعٌ الیٰ حین کی پوری ساعتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام ان کی امت تک پہنچانے میں صرف کر دیں۔ جسے فضا کی ہر موج میں رحمت للعالمین کا آخری پیام لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علی ابیض ولا لا بیض علی اسود الا بالتقویٰ سنائی دیتا تھا۔ جسے معلوم تھا کہ الوطینیہ ھی الوثنیہ وطنیت وہ ہتھیار ہے جو کفر کے جابک دست لوہار نے مسلمانوں کا گلا کاٹنے کے لئے بنا کر تیار کیا ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس کے آگے سر جھکا دیا تو ان کی حالت بد سے بدتر ہو جائے گی جسے ثلث صدی بعد پیش آنیوالی عرب بغاوت کا نتیجہ اسی وقت دکھائی دے رہا تھا۔ جسے فلسطین کا دردناک منظر ۱۹۳۹ء کے بجائے ۱۸۸۴ء میں نظر آتا تھا۔ خُدا کے اس بندے کا نام جمال الدین تھا۔ جسے تمیز و تعارف کے لئے حسینی اور افغانی کہا جاتا ہے۔ اس نے امتِ اسلامیہ کو اس کے فرائض کی طرف متوجہ کیا اور بتلایا کہ تیرا کام قوموں کی امامت کرنا ہے۔ دوسری اقوام کی غُلامی نہیں۔ دنیاوی ترقی کے اعتبار سے تجھے وہاں ہونا چاہیئے جہاں دیکھ کر دوسری قومیں اپنے اندر حوصلہ پیدا کر سکیں۔ تیری جمعیت اسود و احمر

ابیض واصفر سب کے لئے اپنے اندر جگہ رکھتی ہے۔ تیرا کام ہے کہ دنیا کو عالمگیر برادری اور بین الاقوامی محبت کا سبق دے۔ تو صفاہان وسمرقند کی حدبندیوں سے آزاد ہے تجھے آزاد رہنا چاہئیے۔ تیرا ہی قافلہ ہے جو دجلہ، کابل، جمنا، نیل اور دریائے استنبول کے کنارے پر اترا ہوا ہے، مٹا دے رنگ ونسل اور وطن ومرز بوم کی حدبندیوں کو، مٹا دے اس طرح اس نے رب السموات والارض کے سرمدی پیام کنتم خیر امۃ اخرجت للناس کو بار بار دہرایا اور انما المومنون اخوۃ کو یاد دلا کر نمونہ قائم کرنے کی امت اسلامیہ کو تعلیم دی۔ اس کا عالم اسلامی پر کیا اثر ہوا۔ پچھلے پچاس برس کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ اللہ کا منادی تھا جس نے سوتوں کو جگایا۔ جاگتوں کو کام سے لگایا۔ افکار وخیالات میں وہ ہیجان برپا کیا جو سارے مشرق پر طاری ہے۔ سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ نے سوتوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا۔ وہ اپنا پیام سنانے نہ پائے تھے کہ طاغوتی طاقتوں نے ان لوگوں کو اور طرف لگا دیا۔ سید مرحوم کے شاگرد رشید علامہ امیر شکیب ارسلان نے حاضر العالم الاسلامی کی تعلیقات میں لکھا ہے کہ سید جمال الدین نے لوگوں کو جگا دیا تھا۔ مگر تربیت سیاسی چونکہ پوری طرح مکمل نہ ہو سکی تھی اس لئے وطنیت کا زہریلا تخم برگ وبار لے آیا۔ امیر شکیب ارسلان ہی کیا مشرق ومغرب کے اربابِ نظر اس پر متفق ہیں کہ جمال الدین افغانی نے جو کیاری سینچ کر تیار کی تھی اس میں سیاسی تربیت کے نقصان نے وطنیت کو پھلنے پھولنے کا موقع دے دیا۔ نتیجہ وہ نکلا جو آپ دیکھ رہے ہیں۔

وطنیت دماغ انسانی کا وہ ناسور ہے جو اس کے اعمال وافکار کو ہمیشہ کے لئے تباہی وبربادی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔

تسخیر ہے مقصود، تجارت تو اسی سے ‏ ‏ ‏ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے ‏ ‏ ‏ قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

سید جمال الدین افغانی مرحوم نے دیکھا کہ ساحر یورپ مسلمانوں کے قلوب پر وطنیت کا جادو چلا رہا ہے تو انھوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" میں جسے ان کے شاگرد شیخ محمدؒ عبدہٗ پیرس سے نکالتے تھے اور جو اپنی حق نوائی کی وجہ سے صرف آٹھ ماہ زندہ رہ سکا۔ اس کے سب سے پہلے نمبر میں جو ۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۳۔ مارچ ۱۸۸۴ء کو نکلا تھا۔ ایک مقالہ لکھا۔ اس مقالہ کا عنوان ہے الجنسیۃ والدیانۃ الاسلامیہ۔ یہ مقالہ اس عظیم الشان تاریخی رسالہ کے پہلے نمبر کا پہلا مضمون ہے، اور کیوں نہ ہوتا کہ جمال الدینؒ افغانیؒ کے پیام کا اول و آخر وہی تھا جو اس مقالے میں بتلایا گیا ہے۔ اس میں سیّد علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:۔

"اقوام عالم کے مختلف افراد کو جب دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اپنے کو اپنی نسل کو اور اپنے وطن کو بڑا سمجھنے کا بھوت سوار ہے۔ اس سے ظاہر بیں آنکھیں دیکھتی ہیں کہ عصبیت وطنی و نسلی ایک جذبۂ فطری ہے۔ حالانکہ اگر کسی بچّہ کو اس کے مقامِ پیدائش سے دور لے جا کر دوسرے نسلی ماحول میں رکھ دیا جائے تو بڑا ہو کر اپنے مقامِ پیدائش کی بجائے اپنے مقامِ تربیت کا دم بھرنے لگتا ہے۔ فطرت بدل نہیں سکتی۔ اس لئے یہ سمجھنا غلطی ہے کہ عصبیت وطنی یا نسلی فطری جذبہ ہے۔ یہ ماحول اور تربیت سے پیدا ہوتا بلکہ پیدا کیا جاتا ہے۔"

دوسری جگہ اسی مقالے میں لکھتے ہیں:۔

"جب ایک مسلمان کے قلب میں ایمان راسخ ہو جاتا ہے تو وہ نسل و وطن سے منہ موڑ کر اس خاص رابطہ نسل یا وطن سے آگے بڑھتا ہے۔ اور اعتقاد و دین کے عام رابطے سے اپنے کو وابستہ کر دیتا ہے۔"

اسی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ہر رابطہ جو شریعتِ حقہ کے علاوہ ہے شارع علیہ الصلوۃ والسلام کی نظر میں مردود و مذموم ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص سے نفرت کا اظہار فرمایا ہے ——— اس وقت ممالکِ اسلامی جو ایک دوسرے سے الگ الگ ہو رہے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اسلام کے بنیادی اصول ترک کر دینے کا اور سلف صالحین کے راستے سے الگ ہو جانے کا کیونکہ مسلّم اور صحیح اصول کو چھوڑ دینے کا سب سے پہلا اثر حکومتوں پر مرتب ہوتا ہے اگر مسلمان اربابِ اقتدار شرعِ اسلامی کے اصول جامعہ کو اختیار کر لیں اور سلف کے طریقہ پر عمل کریں تو بہت ہی قلیل مدت میں وہ پھر وہی عظمت و سربلندی اللہ کی طرف سے پا سکتے ہیں اور پھر سے ان کو سلطنت و عزت مل سکتی ہے اللہ ہم کو سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

آج جب کہ دنیا میں وطنیت کا دور دورہ ہے۔ دنیا نے ایک بالکل نئے جذبۂ جنگ کے ماتحت ہتھیار سنبھالا ہے۔ یہ جذبہ اپنے سیاسی مذہب کی اشاعت و تبلیغ کا ہے۔ روس کو فکر ہے کہ دنیا اس کے سیاسی مذہب کی پابند ہو جائے جرمنی نازیت کا پیام دنیا کو دے رہا ہے۔ اطالیہ دنیا کو بتا رہا ہے کہ فاسسطی طرزِ حکومت ہی دنیا کا سب سے بہتر سیاسی مذہب ہے، مدت تک ہم نے یہ طعنے سنے ہیں کہ مذہب کے لئے ہمیشہ دنیا میں جنگ ہوتی رہی ہے اور خدا کے نام پر قتل و خون کا بازار گرم رہا ہے۔ طعنہ دینے والے دیکھیں اور مذہب کے خلاف آوازے کسنے والے آنکھیں کھولیں کہ خدائی مذہب کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے والوں کی ستم رانیاں خدا کے نام پر تلوار اٹھانے والوں اور پیام امن دینے والوں کی "مبینہ خوں ریزیوں" سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہیں۔ ایک مدت تک اقوام یورپ نے وطنیت کا خوب ہی راگ الاپا، لیکن جب وہ خود ہی اس سے تھک گئے تو وہی جذبہ وطنیت آخر میں خود مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔ ایک دوسرے اصول جامعہ کی

تلاش شروع ہوئی۔ اب کی بار اس نے سیاسی خیالات کی وحدت کا برن لیا جمہوریت سے نازیت ٹکرا رہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو مٹا دینے کے درپے ہیں بالشویزم سارے یورپ بلکہ ساری دنیا میں اپنا سیاسی مذہب رائج کرنا چاہتا ہے۔ سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو پیام دیا تھا کہ ہمیں دین واعتقاد کے اصول جامعہ کے سوا کسی دوسرے رابطہ کی ضرورت نہیں کہ اس رابطے کے علاوہ تمام رابطے خدا ورسولؐ کی نظر میں مذموم ومردود، اور مسلمانوں کی دنیا وآخرت کے لئے تباہی وبربادی کا پیش خیمہ ہیں۔

اسلام دنیا کو صرف ایمان واعتقاد ہی نہیں بلکہ زندگی کا مکمل لائحۂ عمل بتاتا ہے۔ وہ دنیاوی ترقی کے اسباب اور طریقے بھی اسی تاکید کے ساتھ بتاتا ہے جیسے اخروی مراتب وقربت کی تعلیم دیتا ہے۔ سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ مقالے میں لکھا ہے:۔

"اسلام دوسرے ادیان کی طرح صرف اخروی سعادت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ اخروی سعادت کے ساتھ ساتھ وہ تعلیمات بھی رکھتا ہے جن سے انسانوں کو دنیا میں نعمت وسعادت حاصل ہو۔ اسی کو اصطلاح شرع میں "سعادۃ الدارین" کہا جاتا ہے اس لئے اپنے اصول میں مختلف نسلوں اور مختلف نسلوں، اور مختلف مقامات کی جماعتوں کو یکساں ومساوی درجہ دیا۔"

ہندوستان میں دماغی غلامی اور افکار کی پستی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ لوگ کسی ایسے اصول جامعہ اور رابطہ عامہ کی ضرورت ہی سے انکار کرتے ہیں جو انسانوں کو رنگ ونسل وطن ومرز بوم کا لحاظ کئے بغیر مساوی درجہ عطا کر کے امن وامان کی زندگی کے دروازے ان پر کھول دے، حالانکہ اس کی ضرورت سنجیدہ اہل فکر کے نزدیک مسلم ہے دنیا میں تین بار اب تک مجلس اقوام بنائی جا چکی ہے۔ مگر چونکہ ہر بار بدنیتی سے کمزوروں کو

مساوی حقوق دینے سے انکار کیا گیا اور فیصلہ کا دارومدار سرشماری کے نامعقول طریقے پر رکھا گیا۔ اس لئے ایسی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ ولسن کی بنائی ہوئی مجلسِ اقوام کی ناکامی کے کیا اسباب تھے۔ دماغی و اعتقادی رابطہ کا فقدان اور جبر و تعدی سے کمزوروں کو دبانے کی سعی، اس بے انصافی کی موجب ہوئی جس کے خلاف جرمنی، جاپان اور اطالیہ نے بغاوت کی اور دوسروں کی تباہی کا باعث ہوئے۔ اگر اس مجلس کے ارکان کسی آسمانی قانون کے پابند ہوتے اور ان کے مابین کوئی دماغی و اعتقادی رابطہ موجود ہوتا تو یقین ہے کہ یہ ناکامی نہ ہوتی خود مسلمانوں کے یہاں بھی یہی ہوا کہ جب تک عربی و عجمی کی غیر اسلامی تقسیم قائم کر کے جنگ و جدال نہ شروع ہوئی۔ جامعہ اسلامیہ اور رابطہ دینی قائم و برقرار رہا اور یقین ہے کہ دنیا مستقبل قریب میں ان تمام تقسیموں سے تنگ آکر مجبوراً صحیح رابطہ قائم رکھنے پر مجبور ہو جائے گی۔

مسلمانوں کا فرض ہے کہ دنیا کے سیاسی مذاہب اور وطنی و نسلی تقسیم سے متاثر نہ ہوں بلکہ دنیا کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام امن سنائیں کہ اسی میں دنیا کی نجات ہے اور انسانوں کی دنیاوی و اخروی سربلندی اسی پر منحصر ہے۔

از قاضی عبدالغفار

افغانی کی فارسی تحریریں

میں نے اپنی کتاب میں کسی جگہ شیخ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :۔
"میں کتابیں نہیں لکھتا، میں تو زندہ کتابیں تصنیف کرتا ہوں۔"
یہ قول شیخ کی سیرت اور ان کے عزائم کا ایک آئینہ ہے۔ وہ خود ایک زندہ کتاب تھے۔ ان کے ارادوں کی شورش اور ان کے حوصلوں کی بے باکی انھیں تصنیف و تالیف کے نسبتاً ٹھنڈے اور سست مشاغل سے اتنی دور لے جا چکی تھی کہ اُن کی زندگی گویا اس آسودگی سے بالکل ناآشنا تھی جو اہل قلم کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ جس شخص کی طوفانی زندگی کا یہ عالم ہو کہ وہ آندھی کے جھونکوں کی طرح افغانستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے مصر اور مصر سے یورپ اور یورپ سے ایران اور ایران سے ترکی تک ارباب سیاست کی بساطیں الٹتا ہوا چلا جائے جس کی روئداد حیات یہ ہو کہ صبح اس نے اگر قاہرہ میں آنکھ کھولی تو شام کو وہ پیرس پہنچ گیا۔ اور شام کو اگر وہ ماسکو سے اٹھا تو صبح کو طہران میں داخل ہوا۔ اُس کے لئے ممکن ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کی خاموش وادیوں میں قلم و کاغذ کی آشنائی کے چند لمحے بھی اپنے لئے محفوظ کر سکے! بلکہ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ سید جمال الدین کبھی کوئی کتاب لکھتے تو آخر لکھتے کیا؟ وہ اپنے اُس طوفانی سمندر کو کسی کتاب کے ہزار دو ہزار

اوراق میں بھی کس طرح بند کر سکتے ؟

جو کچھ متفرق مضامین اور مقالات انھوں نے کبھی کبھی لکھے۔ یہ صرف ان کے طوفانی سمندر کی چند موجیں ہیں! ــــــ آہنگر جب لوہے کو تپا کر بھٹی سے نکالتا ہے اور سندان پر رکھ کر ہتھوڑے کی ضربیں لگاتا ہے تو اُس وقت اس سُرخ لوہے سے چنگاریاں اڑتی ہیں۔ یہ متفرق مضامین شیخ کے افکار کی وہی چنگاریاں ہیں! حوادثِ عالم جب اس فولادِ خالص پر ضربیں لگاتے تھے تو اس کی تپش چنگاریاں بن کر اڑتی تھی! ــــــ یہ اُنھی میں سے چند چنگاریاں ہیں۔ اگر ہو سکے تو ان چنگاریوں سے شیخ کے آتشدان کی حرارت کا اندازہ کیجیے!

شیخ اپنی فطرت کی گرمی کو اپنی تحریروں میں بجنسہٖ منتقل کر دیا کرتے تھے اور یہ جرأتِ اخلاق اُن کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ ان کی تحریروں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ شیخ کبھی اپنے موضوع سے بھٹکتے نہیں اور غلط مبحث سے ہمیشہ اپنا دامن بچاکر جو کچھ لکھتے تھے صرف معینہ موضوع کی حدود کے اندر لکھتے تھے۔ مختصر لکھتے تھے لیکن اپنے الفاظ کی نشست میں اپنے احساسات کی پوری قوت صرف کر دیتے تھے۔ یہ خصوصیت بھی اس زمانے کے ادیبوں کے لئے قابلِ تقلید ہے! اس اندازِ بیان کو مبارز الدین صاحب نے اپنے ترجمے میں منتقل کر لینے کی بہت کامیاب کوشش کی ہے۔ مثلاً شیخ کے ایک مضمون سے جس کا عنوان ''ایک خواب ہے'' چند سطریں نقل کرتا ہوں۔

''سارے عالم پر کیسی سیاہ گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں! کیسے عظیم و غلیظ غبار اور کیسی شدید گرد سے فضا معمور ہے! دل کانپ رہے ہیں اور چہروں کے رنگ اڑے ہوئے! یہ کیسی دہشت ناک

آوازیں ہیں۔ یہ کیسے جاں کاہ نعرے ہیں۔ یہ اسلحہ کا شور یہ بجلی کی
کڑک کیا ہے! شمال پہ لرزہ طاری ہے اور جنوب پر اضطراب!
کوہ و دشت لو ہے اور فولاد سے پٹے پڑے ہیں۔ توپوں کی آواز
سنو! ہتھیار اس اندھیرے میں بجلی کی طرح کوند رہے ہیں۔ کوئی
کسی کو نہیں پہچانتا! کوئی کسی کو نہیں جانتا! خون کا ایک عجیب
طلاطم ہے۔ انسانوں کے جسم گھوڑوں اور خچروں کے سموں کے
تلے روندے جا رہے ہیں۔ مختلف قومیں مصروف پیکار ہیں اور
ہزاروں مشکلوں کا سامنا آپڑا ہے۔ دل پر خشم ہیں اور ہونٹ غصے
سے بھینچے ہوئے! بھوت اور دیو لڑ رہے ہیں۔ گھر ویران اور برباد
پڑے ہیں۔ مال ومنال لوٹ اور غارت گری کی نذر ہو گیا۔ دلہنیں
گریہ وزاری کر رہی ہیں اور مائیں اپنے بیٹوں پر نوحہ خواں ہیں...
........نہریں خون سے بھری ہوئی ہیں........عقاب خیر کی
آنکھوں میں ٹھونگیں مار رہا ہے۔ جمشید دماوند بھاگ گیا۔ کوہ ہمالیہ پر
برہما وجد و طرب میں ہے۔ بکرماجیت اپنی قبر سے سر نکال کر نئی
زندگی کا طالب ہے........سارے عالم میں آگ برس
رہی ہے جو تری اور خشکی کو جلائے ڈالتی ہے۔ کمزور طاقتوروں کا
منہ نوچ رہے ہیں۔ مردے اپنی قبروں کے کڑیول اور پتھروں کو
ہلا رہے ہیں........"

اگر شیخ کی حیات اور ۱۹۴۲ء کے درمیانی زمانے کو حذف کر دیجئے تو یہ معلوم
ہوتا ہے کہ گویا آج بھی وہ زندہ ہیں اور موجودہ بین الاقوامی خونریزی پر اپنے تاثرات
حوالۂ قلم کر رہے ہیں ـــــ اسی مضمون میں جب وہ اپنے روحانی تصورات کی طرف

بازگشت کرتے ہیں تو اُن کے الفاظ میں ہمیں مستقبل کا وہ خواب نظر آتا ہے جو انھوں نے (۶۰) سال سے پہلے دیکھا تھا:۔

"سنو! سنو! دیکھو! دیکھو! بادشاہ کوہِ قاف کی چوٹی پر ایستادہ ہے خدائی ہاتھ برہنہ شمشیر لئے آسمان سے نمودار ہوا۔ سارا عالم بقعۂ نور بن رہا ہے۔ آفتاب جہاں تاب طلوع ہوا اور اس نے تیرہ و تار بادلوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ غبار بیٹھ گیا۔ اور وحشت کا دور ختم ہوا۔ جو جس راہ سے آیا تھا۔ اُسی راہ سے لوٹ پڑا۔ ہر زمین پر اس کے مالکِ حقیقی نے قبضہ کر لیا۔ کانٹے خشک ہو گئے۔ کلیاں چٹکنے لگیں اور سارا عالم پھولوں سے چمن بن گیا۔ دیو بھاگ گئے اور شیطان ہلاک ہو گیا .... حکومت خدا کی ہو اور انسانوں کی فریاد اب اللہ ہی سے ہے!"

یہ شیخ کا ادبی رنگ ہے لیکن اس رنگ میں بھی جو افکار سموئے گئے ہیں۔ وہ اُن کی معنوی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔

تمام مضامین میں شیخ کا مذہبی رنگ، رجعت پسندی سے بیگانہ ہے! اور انھوں نے بار بار ضعفِ عقائد اور اوہام پرستی اور خصوصاً علماء کے طبقے پر جو تنقید کی ہے۔ وہ اُن کے ترقی پسند اور وسیع الخیال مشرب پر دلیل ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ شیخ کا زمانہ دنیائے اسلام میں شدید قسم کی ملائیت کا زمانہ تھا۔ تو اُن کے افکار کی عظمت اور بھی زیادہ واضح ہوتی ہے۔ زیرِ نظر مضامین میں جا بجا قدامت پرست اور رجعت پسند ملاؤں پر شیخ نے جو تنقید کی ہے۔ وہ مذہب کے متعلق ان کی وسعتِ نظر کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ مثلاً ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:۔

"عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے علماء "صدریٰ" اور "شمس بازغہ" پڑھ کر
اپنے آپ کو فخریہ طور پر حکیم کہتے ہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ وہ اپنے سیدھے
اور بائیں ہاتھ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اور نہ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا
ہیں کیوں ہیں۔ ہم کو کیا ہونا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے۔۔۔۔۔
عجیب تر بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے سامنے لیمپ رکھ کر اول
شب سے لے کر شمس بازغہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن ایک دفعہ
بھی غور نہیں کرتے کہ لیمپ کی چمنی نکالی جائے تو وہ دھواں
زیادہ کیوں دیتا ہے۔ اور اس پر رکھ دی جائے تو وہ دھواں کیوں
نہیں دیتا۔ پتھر پڑیں۔ ایسے حکیم پر اور ایسی حکمت پر!"
جدید علوم اور قدیم اسلامی علوم کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنا یہ دعوے
پیش کرتے ہیں کہ :-
"تمام مذاہب میں علوم و معارف سے قریب تر دین اسلام ہے
اور دین اسلام کے اصول اساسی اور علوم و معارف کے
درمیان کوئی مخالفت نہیں۔"
اپنے زمانے کے تنگ نظر علماء کی نسبت فرماتے ہیں :-
"وہ عالم نہیں جو اوہام کے وحشت ناک ظلمت کدوں میں بیٹھا ہمیشہ
اپنی شان و شوکت کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ فساد کو اصلاح
سمجھتا ہے۔ خود اسے تو راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ مگر دوسروں کی
راہبری کے لئے کھڑا ہوتا ہے! اسی طرح وہ بھی عالم نہیں جس پر
پرانے قبرستان کا ہولناک بھوت سوار رہتا ہے۔ جو ہمیشہ خرابی
اور ہلاکت کی پیش گوئیاں کرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ سچ پوچھو تو یہ لوگ

عالم نہیں بلکہ تباہی و بربادی کے علمبردار ہیں اور ہلاکت و ویرانی کے خبر رساں اور مصائب و آلام کے قاصد۔ عالم نہیں ہیں بلکہ ننگِ عالم ہیں!"

آج بھی ہمارے ملک میں کتنے سر ایسے ہیں جن پر یہ کاغذی ٹوپی بالکل ٹھیک بیٹھتی ہے۔ شیخ نے آج سے (۶۰) سال پہلے ہی ان حضرات کے خد و خال کی پوری نشان دہی کر دی تھی!

ایک مقام پر علوم جدیدہ سے نام نہاد علماء کی بے پروائی پر طنز فرماتے ہیں :-

"پھر ایک بار ندا دے کر کہتا ہوں کہ اے علماء ہندوستان! اے منابعِ انظار دقیق! اے معادن آرائے سدید! اے ینابعِ افکار عمیق۔ اے اصحاب تالیف و تصنیف کثیر! اے اربابِ رسائل و تعلیقات انیق! کیا تمہاری پاک طینت اور تمہاری مقدس فطرتِ الٰہیہ واقعی اس بات پر راضی و خوشنود ہو جاتی ہے کہ اپنے روشن اور تابندہ ذہنوں کو ایسے مباحث میں صرف کرو۔ جیسے تصدیق کے تصور کے وقت دو مختلف چیزوں کا متحد ہونا لازم آتا ہے یا نہیں۔ اگر زید کہتا ہے کہ جو کچھ کل میں کہوں گا وہ جھوٹ ہوگا۔ اور جب کل آجاتا ہے تو کہتا ہے کہ گزشتہ کل جو کچھ کہا تھا وہ جھوٹ تھا۔ کیا اس کا جھوٹ مستلزم سچ اور اس کا صدق مستلزم کذب نہ ہوگا۔"

اس سلسلۂ کلام میں سائنس کے ایجادات کا ذکر کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ :-

"آیا یہ جائز ہے کہ تم ان چیزوں سے اس لئے اغماز برتو کہ یہ ابن سینا کی شفا اور شہاب الدین کے حکمتِ اشراق میں مذکور نہیں ہیں؟

کیا یہ تم پر واجب نہیں کہ آنے والی نسلوں کی خدمت اپنے افکار عالیہ کے ذریعے سے کرو جیسی کہ سابقین کرام نے تمہاری خدمت کی ہے۔"

تعجب نہ ہونا چاہیے اگر میں یہ کہوں کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد آج سے (۶۰) سال قبل پہلے شخص سید جمال الدین افغانی تھے جنھوں نے فلسفہ "خودی" کو ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ اُن کی ساری زندگی بجائے خود اس فلسفے کی ترجمانی تھی۔ فضائلِ دین اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ:-

"قوم کا ہر فرد رتبۂ نبوت کے سوا کہ یہ رتبۂ الٰہی ہے۔ اپنے آپ کو تمام مراتب و فضائلِ انسانی کا مستحق و سزاوار سمجھے۔ اپنی ذات میں نقص انحطاط اور نااہلی کے تصوّر کو جگہ نہ دے۔ دین اسلام نے تمام افراد انسانی پر شرافت کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ہر فضیلت اور ہر کمال میں ہر فرد کے حق کو تسلیم کیا ہے جنس اور صنف کے امتیاز کو اٹھا دیا ہے اور افراد انسانی کے فضیلت کو صرف عقلی اور نفسی کمال پر منحصر کیا ہے۔"

ایک دوسرے مقام میں لکھتے ہیں کہ:-

"اُن تین عقائد میں سے سب سے پہلا اعتقاد یہ ہے کہ انسان زمین کا فرشتہ اور وہی اشرف المخلوقات ہے۔۔۔۔۔ انسان اس عالم میں کمالات حاصل کرنے کے لئے آیا ہے ـــــ ایسے کمالات جو اسے تنگ و تاریک عالم سے جو در حقیقت

بیت الحزن کہلانے کا مستحق ہے۔ ایک افضل اعلیٰ اور وسیع و عریض عالم میں منتقل کرنے کے قابل ہوں......"

ہندوستان میں شیخ کے تصورات کی اس روح کا دامن نصف صدی بعد علامہ اقبال کی "فکرِ فلک پیما" نے پکڑا ــــــ اس طرح کہ یہ فلسفہ خودی شاعرِ مشرق کے پیام کا ایک زندہ اساس بن گیا!

شیخ کی زندگی کے قومی افکار کا جو عکس اُن کے مقالات میں نظر آتا ہے۔ اُس کی شان پیغمبرانہ معلوم ہوتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہی مسائل جن کی طرف شیخ نصف صدی پہلے ہندوستان کے مسلمانوں کو بلا رہے تھے۔ آج ہماری اجتماعی زندگی کے اساسی مسائل سمجھے جا رہے ہیں۔ مثلاً وحدتِ زبان کا مسئلہ۔ بہت کم اہلِ نظر ایسے ہیں جو اس حقیقت سے واقف ہوں کہ قومی زبان کو تعلیم کا واسطہ بنانے کے اصول اساسی پر سب سے پہلے شیخ ہی نے زور دیا تھا حتیٰ کہ حیدر آباد میں اُردو زبان کی ایک جامعہ قائم کرنے کی تحریک بھی سب سے پہلے شیخ ہی نے شروع کی تھی اس واقعہ کی تفصیلات کا میں نے "آثارِ جمال الدین" میں ذکر کیا ہے۔

زیرِ نظر مقالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق شیخ کے احساسات کس قدر قوی تھے۔ "قومی وحدت اور اتحادِ زبان" پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

> اُس میں شک نہیں کہ اس دنیا میں بقا و قیام کے لئے وحدتِ زبان اتحادِ مذہب سے بھی زیادہ دیرپا ہے۔ کیونکہ بخلاف مذہب کے زبان میں بہت جلد کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ایک قوم جو ایک زبان بولتی ہے۔ ہزار سال کی مدت میں دو تین مرتبہ اپنے مذہب میں تغیر و تبدل کر دیتی ہے۔ لیکن اُس کی

قومیت میں جو اتحاد زبان سے عبارت ہوتی ہے۔ کوئی خلل واقع
نہیں ہوتا۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ دنیا کے اکثر و بیشتر معاملات میں اتحادِ
زبان سے جو ربط و اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ اس کا اثر ارتباط دینی
سے زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔"

پھر اسی مضمون میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ:۔

"متحدہ قومیت جو عین اتحاد زبان ہے یہ کمالات اُسی وقت
حاصل کرے گی جب کہ قوم کی زبان جو گویا اس کے افراد کا
نفس ناطقہ ہے اپنی قومیت و سلامتی کے لئے کافی ہو۔"

پھر فرماتے ہیں کہ:۔

"بات جب یہاں تک پہنچ چکی تو اب میں ہندوستان کو پیشِ نظر
رکھ کر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ایسے ہندوستانی جو کوہِ بصیرت کی
چوٹی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور قومیت کے مفہوم کو خوب سمجھ چکے
ہیں۔ کیوں اس اہم مسئلے کی طرف توجہ نہیں کرتے..... حالانکہ
اُن کی قومیت کی بقا اور اس کے ثمرات سے برومند ہونا
مدارس میں وطنی زبان میں تعلیم و تعلّم پر موقوف ہے..... عقلا
کے ذمّے پہلا فریضہ اپنے وطن کی زبان کو وسعت دینا ہے
پھر کیوں اپنی وطنی زبان خصوصاً اردو زبان میں جسے عمومی زبان کا
رتبہ حاصل ہے جدید علوم کا ترجمہ نہیں کرتے........

جو کچھ اب تک کہا گیا اُس سے بخوبی ظاہر ہے کہ ہندوستان
کے تمام طبقات پر خواہ وہ علماء ہوں خواہ امرا۔ خواہ ارباب تجارت
ہوں خواہ اصحاب فلاحت سب پر واجب ہے کہ آپس میں

اتفاق کرکے اپنے کالجوں اور مدرسوں میں ہندوستانی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیں.......“

اُس صاحبِ نظر کی وسعتِ نظر کا اندازہ کیجیے جو آج سے (۶۶) سال پہلے قومیت کے اس اساس کو تباہ حال ہندوستان کے پراگندہ حال مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہا تھا! آج زبان کا مسئلہ ایک عام فہم مسئلہ بن گیا ہے جس پر ہر وہ شخص دو چار سطریں لکھ سکتا ہے جس کو لکھنا آتا ہو۔ لیکن ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار کے عروج اور قومی زندگی کی انتہائی پستی کے وقت وحدتِ قومی کا یہ تخیل پیش کرنا اور اس کی طرف اہلِ ہندوستان کو دعوت دینا ایک مجدد وقت ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

شیخ کی تحریروں کے اس مختصر مجموعے کے اختصار میں بھی ——— باوجود اختصار ——— اُن کے افکارِ عالیہ کے ہزاروں نقوش ہیں جو اہلِ نظر کو دعوتِ نظر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے زورِ قلم کے سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ان کی قوتِ بیان ہے جس میں بعض اوقات ایسا تشدد پیدا ہو جاتا ہے جسے لوگ شیخ کے مزاج کی عصبیت سے منسوب کرتے تھے۔ مگر دراصل یہ عصبیت اُن کے عقائد اور احساسات کی وہ بے پناہ قوت تھی جو اُن کو ایک آندھی کے جھونکے کی طرح تمام دنیا میں استبداد کی ہر طاقت سے ٹکرا لینے پر مجبور کرتی تھی۔ وہ الفاظ کا سیاسی کھیل کبھی نہ کھیلتے تھے ——— صاف کہتے تھے جس طرح کہ صاف سمجھتے تھے۔ پتھر کا جواب پتھر سے دیتے تھے۔ لوہے کو لوہے سے کاٹتے تھے۔ اور یہ جراُت اُن کو اس لئے حاصل تھی کہ اُن کا ضمیر پاک تھا۔ اور باطل سے سمجھوتہ کرنے پر کسی حال میں بھی آمادہ نہ ہوتا تھا۔

شیخ کے مزاج کی گرمی اور اُن کے طرزِ تحریر کی قوت کے بعض نمونے میں نے

"آثار" میں پیش کئے ہیں۔لیکن ان مقالات میں اگر شیخ کا یہ رنگ دیکھنا ہو تو "شرح حال افغانی" اور اُس آخری مکتوب کو دیکھئے جو شیخ نے شاہِ ایران کے متعلق علمائے ایران کو لکھا تھا۔ علمائے ایران کے نام اُن کا آخری خط ایک تاریخی خط ہے وہ ایک انقلابی تحریر تھی جو علماء کے رجعت پسند طبقے کو بھی انقلاب کے جھنڈے کے نیچے کھینچ لائی جس طرح مصر میں اُسی طرح ایران میں اور اُسی طرح ترکی میں عہدِ نو کی انقلابی تحریکات کے داعی اعظم جمال الدین افغانی تھے۔بلکہ وہ صرف داعی نہ تھے بلکہ ان تمام ممالک میں دستوری اور جمہوری تعمیر کے سب سے بڑے معمار تھے اس لئے ان ممالک کے سیاسی حالات کے متعلق اُن کی تحریریں تاریخ کا اہم جزو ہیں اور خود ان کی بے باک نفسیات کا ایک بصیرت افروز آئینہ۔ناصرالدین شاہ کے متعلق علمائے ایران کو شیخ نے جن الفاظ میں مخاطب کیا وہ ایسے الفاظ ہیں کہ شاید ہی دنیا کی تاریخ میں ایسے سخت الفاظ کسی مقتدر بادشاہ کے متعلق اس کی زندگی میں لکھے گئے ہوں۔ ایرانی قوم کی بدحالی کا پس منظر اس طرح پیش کرتے ہیں :-

> "میں کہتا ہوں کہ ملّتِ ایران کو ان مسلسل حوادث نے اپنے دین و ایمان کے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اور مسلمانوں کے حقوق پر اغیار کی دست اندازیوں نے اسے اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ کسی بھلائی کے حصول کی کوشش کر سکے!......ان کے نفوس نے روشنی کو چھوڑ دیا ہے.........ان کے افکار مضمحل ہو گئے ہیں ....وہ صحیح راستے سے کچھ اس طرح بھٹکے ہوئے ہیں کہ انھیں کوئی راستہ بتانے والا نہیں ملتا۔"

پھر بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں :-

"بادشاہ کا دل و دماغ دونوں ماؤف ہو چکے ہیں اس کی سیرت

بگڑ چکی ہے۔ وہ ملکی مفاد اور اللہ کی مخلوق کے مفاد سے عاجز
ہو چکا ہے...... جب سے بلاد فرنگ سے واپس آیا۔ حیا
کے جامے کو اس نے بالکل اتار پھینکا ہے۔ شرابیں پیتا ہے
کفار سے دوستی کرتا ہے اور دینداروں سے دشمنی رکھتا ہے
...... سلطنت ایران کے ایک بڑے حصے اور اس کے منافع
کو دشمنوں کے ہاتھ بیچ رہا ہے...... یہ مجرم بیع کے لئے
سلطنتوں کے سامنے سارے بلاد ایران کو پیش کر رہا ہے......"

قصہ مختصر، وقت گزر جاتا ہے۔ مگر مردانِ خُدا کی بات اپنی جگہ قائم رہتی ہے
مجاہدوں کے قافلے اپنی منزلیں طے کرتے ہیں۔ اور ہر منزل پر اپنے قدموں کے
ایسے نشان چھوڑ جاتے ہیں جو مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ قدموں کی کشتیاں جب
زندگی کے طوفان سے گزرتی ہیں تو حقائق کی چٹانوں پر تاریخ کی یہ سر بہ فلک منار
طوفان زدہ ملاحوں کو روشنی اور سلامتی بخشتے ہیں۔ بشرطیکہ سمندروں کے مسافر
صاحب بصیرت ہوں!

آں ہنرمندے کہ بر فطرت فزود	راز خود را بر نگاہ ما کشود
آفریند کائناتِ دیگرے	قلب کا بخشد حیات دیگرے
زاں فراوانی کہ اندر جان اوست	ہر تہی را پر نمودن شان اوست

از قائدِ ملت بہادر یار جنگ رحمۃ اللہ علیہ

افغانیؒ کا پیام

علامہ سید جمال الدین افغانی کی یاد منانے، اُن کے افکار سے اپنی زندگیوں کے لئے سامان حیات پیدا کرنے آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں. علامہ انیسویں صدی کی آخری یادگار ہیں۔ جب ملّتِ مرحوم کی سوکھی ہوئی کھیتیوں پر خداوندِ قدوس کو رحم آیا۔ اور جب کہ ہر طرف انحطاط و زوال کا دور دورہ تھا۔ بادشاہوں میں اسلام دوستی کے بجائے عیش پرستی داخل ہو گئی تھی۔ ترکستان میں سلطان عبدالحمید کی طاقت گھٹتی جا رہی تھی اور یورپ اسے مردِ بیمار سمجھنے لگا تھا۔ ایران اپنے بادشاہ کی بدعنوانیوں کا شکار تھا! افغانستان میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی ایک ایسا زمانہ تھا جبکہ چاروں طرف اسلامی دنیا میں انحطاط کے آثار نمایاں تھے۔ اللہ تعالیٰ ایک ایسے فرد کو پیدا کرتا ہے جس نے نہ صرف سوئی ہوئی قوم کو جگایا۔ بلکہ اسلامی دنیا کی روح کو اس شدت کے ساتھ بیدار کیا جس کے آثار آج تک ہم میں موجود اور زندہ ہیں۔ علامہ سید جمال الدین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر آج اور کل ان جلسوں میں مقالے اور مضامین پیش کئے جائیں گے جن کو سن کر آپ مرحوم کی تعلیمات اور تاثرات سے صحیح طور پر واقف ہو سکیں گے جس عظیم الشان ہستی کی آپ یاد منا رہے ہیں، اس ہستی کے ساتھ مجھے بھی اس اعتبار سے نسبت ہے کہ صدیاں کیوں نہ

گزری ہوں۔ میں بھی اپنے آپ کو افغانی تصوّر کرتا ہوں۔ میرا ایقان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر ایک قوم سے جس میں سپاہیانہ جوہر موجود ہیں! اسلامی تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں عظیم الشان خدمات انجام دلائی ہیں۔ عرب کے سپاہی منش باشندے حضرت رسولِ کریم کے پیام گرامی پر اٹھے اور اس پیام کو ساری دنیا میں پہنچایا جو تاریخ کے طالبعلموں سے پوشیدہ نہیں۔ اسلام کے خلاف چھٹی صدی ہجری میں مغلوں کا عظیم الشان سیلاب اٹھا۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ع

پاسباں مل گئے کعبے کو صنمخانے سے

ان ہی مغلوں نے حلقہ بگوش اسلام ہو کر عربی فتوحات کی تکمیل کی۔ اور ایک طرف سارے ہندوستان میں اللہ اکبر کا غلغلہ بلند کیا۔ تو دوسری طرف بلقان اور یورپ کے دوسرے ممالک میں صدائے لا الہ الا اللہ بلند کی۔

علاّمہ افغانی کی وطنیت سے متعلق ان کے سیرت نگاروں میں اختلاف ہے کہ وہ افغانی تھے یا ایرانی۔ ایرانیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ایرانی تھے اور اسدآباد کے رہنے والے! افغانیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ افغانی تھے اور اسعدآباد کے رہنے والے! وہ اسعدآباد کے باشندے ہوں یا اسدآباد کے لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ ہمیشہ اسلام کے شیر اور آسمانِ سعادت کے آفتاب تھے! ایک سو سال قبل اسلام کا یہ عظیم الشان فرزند بمقام اسعدآباد پیدا ہوا۔ گمنامی کی حالت میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ آزادی و حرّیت کا علمبردار بن کر دنیائے اسلام کے لئے باعث فخر ثابت ہوگا۔ علامہ جمال الدین افغانی نے اپنی عمر کے بیس سال بھی ختم نہ کئے تھے کہ انھوں نے سفر حج کا عزم کیا اور وہاں سے واپس آکر امیر دوست محمد خاں کے دربار میں ایک مقام پیدا کر لیا۔ دوست محمد خاں کے انتقال کے بعد امیر شیر علی خاں سے علامہ مرحوم کی نہ بنی۔ علامہ مرحوم نے ان کے

بڑے بھائی اعظم خان کا ساتھ دیا۔ اور جب افغانستان کی زمین ان کے لئے تنگ ہو گئی تو وطن سے ہجرت کی اور مصر چلے گئے اور وہاں سے استنبول کا ارادہ کیا علامہ کی باریک بین نگاہیں ملتِ اسلامیہ کی موجودہ حالت اور اس کی پستی کے اسباب کا پوری توجہ سے جائزہ لے رہی تھیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جس جماعت کے دوش پر رہبری اور رہنمائی کی ذمہ داری ہے اور جو علمبردارِ دین و مذہب ہیں وہی اپنی اتحادی قوتوں کے فقدان عمل سے بیگانگی، للہیت اور خلوص سے بعد اور نفسانیت و خود غرضی کے جذبات سے معمور ہو کر اسلام کی تباہی کا باعث ہو رہے ہیں۔ تو علامہ نے اپنی زندگی کا سب سے پہلا مقصد یہی قرار دیا کہ اس جماعت کی اصلاح کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ استنبول میں ان کی سب سے پہلی ٹکر شیخ الاسلام سے ہوئی۔ دار الخلافہ میں علامہ ابھی کمر کھولنے نہ پائے تھے کہ خارج البلد کئے گئے وہاں سے پھر مصر آئے اور جامعہ ازہر کے طلبہ و علماء میں اپنے خیالات کی اشاعت شروع کی۔ شیخ محمد عبدہ جیسا عظیم المرتبت شاگرد اور سعد زاغلول جیسا مستقبل ساز قائد تھوڑے ہی دنوں کی کاوش سے سید مرحوم نے پیدا کر لیا۔

اس وقت مصر پر خدیو اسمعیل حکومت کر رہا تھا۔ جو یورپ کے سرمایہ داروں کا مقروض ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ سونا ہی نہیں بلکہ مملکت مصر بھی اس کے ہاتھوں سے چلی جا رہی تھی۔ اس وقت علامہ خاموش نہ بیٹھ سکے۔ مصر کو خدیو سے نجات دلانے اور اسلامی ملک کو یورپ کے پنجۂ حرص و آز سے بچانے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ یہی سب سے بڑی خدمت تھی جو مصر میں بیٹھ کر علامہ نے انجام دی علامہ مرحوم نے یہی مناسب سمجھا کہ خدیو اسمعیل کو قتل کر کے یہاں کے تخت کو الٹ دیا جائے۔ تاکہ دوسروں کے تسلط سے اس ملک کو بچایا جا سکے۔ علامہ نے شیخ عبدہ سے مل کر خدیو کے قتل کا منصوبہ کر لیا تھا۔ لیکن اس اثناء میں سلطانِ ترکی نے

خدیو اسمٰعیل کو معزول کر دیا۔ توفیق جانشین ہوئے۔ خدیو توفیق تخت نشینی سے قبل سید افغانی کی جماعت کا رکن اور ان کا ارادت کیش تھا۔ علامہ کے سارے منصوبوں سے واقف تھا۔ جب تخت نشینی کے بعد اس نے محسوس کیا کہ مغربی دول کے آگے ہتھیار رکھنے پر وہ مجبور ہے تو اس نے علامہ کو حکم دیا کہ وہ مصر سے باہر چلے جائیں۔ سچ ہے کہ مقام حکومت و بادشاہت اور مقام دولت ہی ایسا مقام ہے جہاں انسانیت کو بمشکل باقی رکھا جا سکتا ہے ؎

گر بدولت برسی مست نگردی مردی ۔۔۔ بادہ ہا خوردن و ہوشیار نشستن سہل است

یہاں سے علامہ حیدر آباد آتے ہیں۔ اس وقت جب کہ انھوں نے تمام ملوکیت سوز قوتیں پیدا کر دی تھیں اور شیخ عبدہٗ و زاغلول شاہ جیسے جانشین پیدا کر چکے تھے۔ آپ حیدر آباد میں دو سال رہے۔ جمہوریت کا وہ شیدائی اور عمومیت کا وہ فدائی جو قاچار کو قتل کرنے اور خدیو اسمٰعیل کو ختم کرنے کے منصوبے گانٹھ رہا ہو اور جس کو دنیا آج بھی شہنشاہیت و ملوکیت کا دشمن تصور کرتی ہو حیدر آباد آتا ہے اور دو سال حیدر میں رہتا ہے۔ اس وقت کیا حیدر آباد اپنی موجودہ حالت میں نہ تھا کیا بلارم والوال کی چھاؤنیاں اس وقت انگریزی فوجوں سے خالی تھیں؟ کیا اس وقت حیدر آباد میں انگریزی رزیڈنسی قائم نہ ہوئی تھی؟ اور کیا حیدر آباد میں اس وقت با اقتدار ملوکیت کام نہیں کر رہی تھی؟ پھر کیا وجہ ہے کہ شہنشاہیت کا دشمن ملوکیت کا قاتل جمال الدین دو سال حیدر آباد میں رہتا ہے۔ اور اس ملوکیت کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جمہوریت یہاں کیا حیثیت اختیار کرے گی اور کس جانب منتقل ہوگی۔

سید جمال الدین دور بین نظر رکھتے تھے ان کی عواقب پر نظر تھی قومیت پرستی کی رو میں نہیں بہہ رہے تھے۔ بلکہ ان کی نگاہیں مستقبل کے پردوں کو چاک کر کے

سو برس آگے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ ترکی، ایران، افغانستان اور مصر میں ملوکیت کی تباہی ایک اسلامی جمہوریت کے احیاء کا باعث ہو گی۔ لیکن حیدر آباد میں جمہوریت اسلام کی بیخ کنی اور مسلمانوں کی غلامی کے نتائج پیدا کریگی۔

بڑا ہی افسوس ہے کہ علامہ سے متعلق حیدر آباد میں کوئی پتہ نہیں چلتا کہ کیا مشاغل تھے۔ البتہ قاضی عبدالغفار صاحب نے اپنے مقالہ میں بتایا ہے کہ آپ کی سید علی بلگرامی اور نواب سول یار جنگ اولیٰ سے ملاقات رہی۔ جب اعرابی پاشا نے سید افغانی کی سلگائی ہوئی آگ کے شعلوں کو قصر عابدین کے رواقوں تک پہنچا دیا۔ تو انگریزوں کو اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں اس کے شعلے ہندوستان تک نہ پہنچیں۔ سید مرحوم کلکتہ میں نظر بند کر دیئے گئے اور اس وقت تک وہیں رہے جب تک مصر کے حالات انگریزوں کے لئے قابل اطمینان نہ ہو گئے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہندوستان سے علامہ امریکہ گئے اور وہاں سے واپس آکر فرانس میں قیام کیا۔ پیرس میں شیخ محمد عبدہ بھی ان سے آکر مل گئے۔ اور العروۃ الوثقیٰ نامی رسالہ جاری کیا جو گو زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ لیکن اس نے بلادِ اسلامیہ اور یورپ میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی۔ آپ کچھ دنوں کے لئے لندن گئے روس کا سفر کیا۔ یہاں شاہ قاچار سے ملاقات ہو گئی۔ وہ آپ کو ایران لے آئے۔ اور وزارت کے منصب پر فائز کیا۔ شاہ قاچار سے آپ خوش نہیں تھے۔ دونوں کے خیالات میں زبردست فرق تھا۔

ایران بھی مصر کی طرح اس وقت مغربی اقوام کی حرص و آز کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایک طرف سے روس آذربائیجان اور خراسان کے علاقوں پر آہستہ آہستہ مختلف حیلوں سے قبضہ کر رہا تھا۔ تو دوسری طرف تمباکو کی یوروپی کاشت اور معدنیات کے ٹھیکے انگریزوں کو دیئے جا رہے تھے۔ علامہ مرحوم کی دوربین نگاہیں

اس قدیم اسلامی سلطنت کو دیو مغرب کے پنجہ میں پھنسا ہوا دیکھ رہی تھیں اور برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے اپنی عادت کے مطابق علماء اور عوام کو اس کے خلاف احتجاج کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔ ناصرالدین شاہ قاچار سے تعلقات بگڑے چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ جمال الدین مرحوم کو پابہ زنجیر کر کے ایران سے بحالتِ بخار بڑی طرح نکال دیا۔ لندن میں کچھ دنوں قیام کے بعد سلطان عبدالحمید کی دعوت پر آپ قسطنطنیہ پہنچے۔ یہاں پان اسلامزم کی تحریک شروع کی جو سید مرحوم کا آخری اور شاندار کارنامہ ہے۔ اور آج بہترین شکل میں میثاق سعد آباد کے نام سے موجود ہے۔ اس کا سہرا مصطفےٰ کمال اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے سر رہا۔ یقین ہے کہ علامہ کی روح اپنے اس مقصد کی تکمیل کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہوگی۔

علامہ کے پیش نظر جمہوریت کا احیاء شہنشاہیت کا قلع قمع نہیں۔ بلکہ تسلّط اسلامیہ تھا۔ آپ ملّتِ اسلامیہ کو سدھارنے اور آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ ان کے راستے میں اگر شاہانہ اور ملوکانہ طاقتیں پڑتی تھیں تو وہ اُن کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ اور ان کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ بعض ان کے سیرت نگار رابطۂ اسلامی تحریک سے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ علامہ نے سلطان عبدالحمید کی خاطر شروع کی تھی۔ جس کا سر نیاز امیر شیر علی جیسے مستبد بادشاہ، خدیو اسمٰعیل جیسے عیاش سلطان اور ناصرالدین شاہ قاچار جیسے عظیم المرتبت شہنشاہ کے سامنے نہ جھکا۔ اور جس کی آنکھیں ہمیشہ افرنگی سیاست و تدبر کا مردانہ وار مقابلہ کرتی رہیں۔ اس کی نسبت یہ بدگمانی گناہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیّد مرحوم کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی مملکتیں چاہے جتنی آزاد اور قوی ہوں اپنی انفرادی حیثیت میں مغربی سیلاب

تسلط کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اسی تجربے کے بعد وہ آخر
اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مشرق میں ملّتِ اسلامیہ کی بقا اور مغربی سیلاب کا
مقابلہ صرف ان اسلامی قوتوں کے باہمی ربط میں مضمر ہے۔

از علامہ اقبالؒ
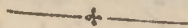
زیارت ارواح جمال الدین افغانی وسعید حلیم پاشا

[آفرینش کی ابتدا ابھی ہوئی ہے، چاند، سورج اور ستارے اپنے اپنے مداروں پر گردش شروع کرتے ہیں، صبح وشام کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن ہنوز ملک آدم محض ایک خاکدان ہے۔ اس لئے چرخ نیلی فام ارض خاکی کو طعنہ دیتا ہے کہ "سازو برگ دلبری کے ساتھ زندہ رہ یا کمزوری کے ننگ وعار سے موت قبول کر۔" ارض خاکی بارگاہ رب العزت میں شکایت کرتی ہے اور اس کو آدم عطا ہوتا ہے۔ اتنے میں حضرت رومیؒ کی روح آشکارا ہوتی ہے، اور معراج کے اسرار کو کھول کر بیان کرتی ہے۔ پھر زمان ومکان کی روح مسافر کو عالم علوی کی سیاحت کراتی ہے۔ اس سیاحت میں حضرت رومی زندہ رود (اقبال) کی راہبری کرتے ہیں۔ سب سے پہلے فلک قمر کی سیر ہوتی ہے، اور یہاں زندہ رود عارف ہندی سے مل کر وادی یرعمید میں داخل ہوتا ہے، اور طاسین گوتم، طاسین زردشت۔ اور طاسین محمدؐ سے استفادہ کرتا ہے۔ فلک قمر کی سیر کے بعد مسافر فلک عطارد میں داخل ہوتا ہے اور یہاں وہ ارواح جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا سے

ملاقی ہوتا ہے۔ عطارد کا یہ حال ہے کہ وہ زمین سے زیادہ پرانا ہے۔ آدمی کا وہاں نام ونشان نہیں، ایک ہُو کا عالم ہے، جدھر نظر جاتی ہے ایک وحشت کا عالم ہے، زندہ رود یہ سماں دیکھ کر ابھی حیران ہی ہے کہ یکایک قریب سے اذان کی آواز آتی ہے۔ اور زندہ رود روحِ رومی سے دریافت کرتا ہے کہ

از کجا می آید آوازِ اذان ؟

رُومی

گفت رومی "ایں مقامِ اولیاست | آشنا ایں خاک داں با خاکِ ماست
زائرانِ ایں مقامِ ارجمند | پاک مرداں از مقامات بلند

زندہ رود آگے بڑھتا ہے، اور کیا دیکھتا ہے کہ

رفتم و دیدم دو مرد اندر قیام | مقتدی تاتار و افغانی امام

پیرِ رومی ان دونوں کا تعارف کراتے ہیں:-

گفت مشرق زیں دو کس بہتر نزاد | ناخن شاں عقدہ ہائے ما کشاد
سید السادات مولینا جمال | زندہ از گفتار او سنگ و سفال
تُرک سالار آں حلیم دردمند | فکر او مثلِ مقام او بلند
با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است | ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است"

دونوں آگے بڑھتے ہیں، اور نماز میں شامل ہو جاتے ہیں۔ آیئے ہم بھی ان کے ساتھ اس طاعت میں شریک ہو جائیں]

قرأتِ آں پیرِ مردِ سخت کوش | سورۂ والنجم و آں دشتِ خموش
قرأتے کز وے خلیل آید بوجد | روحِ پاکِ جبرئیل آید بوجد!
دل ازو در سینہ گردد ناصبور | شورِ الا اللہ خیزد از قبور!
اضطراب شعلہ بخشد دود را | سوز و مستی می دہد داؤد را

آشکارا هر غیاب از قرأتش
بے حجاب ام الکتاب از قرأتش

من ز جا برخاستم بعد از نماز   دستِ او بوسیدم از راهِ نیاز
گفت رومی "ذرّه گردوں نورد   در دل او یک جهاں سوز و درد
چشم جز بر خویشتن نکشادهٔ   دل بکس نا دادهٔ آزادهٔ
تند سیر اندر فراخائے وجود
من ز شوخی گویم او را "زنده رود"

افغانی

زنده رود! از خاکدان ما بگوئے   از زمین و آسمانِ ما بگوئے
خاکی و چوں قدسیاں روشن بصر!   از مسلماناں بده ما را خبر!

زنده رود

در ضمیرِ ملتِ گیتی شکن   دیده ام آویزشِ دین و وطن
روح در تن مرده از ضعفِ یقین   نا امید از قوتِ دینِ مبین
ترک و ایران و عرب مستِ فرنگ   هر کسے را در گلو شستِ فرنگ
مشرق از سلطانیِ مغرب خراب   اشتراک از دین و ملت برده تاب

افغانی

دین و وطن

لردِ مغرب آں سراپا مکر و فن   اهلِ دیں را داد تعلیمِ وطن
او بفکرِ مرکز و تو در نفاق   بگذر از شام و فلسطین و عراق
تو اگر داری تمیزِ خوب و زشت   دل نه بندی با کلوخ و سنگ و خشت
چیست دیں برخاستن از روئے خاک   تا ز خود آگاه گردد جانِ پاک

می نگنجد آنکه گفت اللہ هو　　　در حدود این نظام چارسو

هر که از خاک و بر خیزد ز خاک　　　حیف اگر در خاک میرد جان پاک

گرچه آدم بر دمید از آب و گل　　　رنگ و نم چون گل کشید از آب و گل

حیف اگر در آب و گل غلطد مدام　　　حیف اگر برتر نپرد زین مقام

گفت تن در شو بخاک رهگذر　　　گفت جان پهنائے عالم را نگر

جان نگنجد در جهات اے هوشمند　　　مرد حر بیگانه از هر قید و بند

حر ز خاک تیره آید در خروش
زانکه از بازان نیاید کار موش

آن کف خاکے که نامیدی وطن　　　این که گوئی مصر و ایران و یمن

با وطن اهل وطن را نسبتے است　　　زانکه از خاکش طلوع ملتے است

اندرین نسبت اگر داری نظر　　　نکتهٔ بینی ز مو باریک تر

گرچه از مشرق برآید آفتاب　　　با تجلی هائے شوخ و بے حجاب

در تب و تاب است از سوز درون　　　تا ز قید شرق و غرب آید برون

بر دمد از مشرق خود جلوه مست　　　تا همه آفاق را آرد بدست

فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچه او از روئے نسبت خاوری است

اشتراک و ملوکیت

صاحب سرمایه[1] از نسل خلیل　　　یعنی آن پیغمبر بے جبرئیل

زانکه حق در باطل او مضمر است　　　قلب او مومن دماغش کافر است

---

[1] صاحب سرمایه: کارل مارکس، مصنف کتاب سرمایه، که اصول کتاب را درین کتاب وضع کرده۔

غربیان گم کرده اند افلاک را　　　در شکم جویند جان پاک را!
رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک　　　جز بتن کاری ندارد اشتراک
دین آن پیغمبر ناحق شناس　　　بر مساوات شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نه در آب و گل است!

هم ملوکیت بدن را فربهی است　　　سینهٔ بی نور او از دل تهی است
مثل زنبوری که بر گل می چرد　　　برگ را بگذارد و شهدش برد
شاخ و برگ و رنگ و بوی گل همان　　　بر جمالش نالهٔ بلبل همان
از طلسم رنگ و بوی او گذر　　　ترک صورت گوی و در معنی نگر

مرگ باطن گرچه دیدن مشکل است
گل مخوان او را که در معنی گل است

هر دو را جان ناصبور و ناشکیب　　　هر دو یزدان ناشناس آدم فریب
زندگی این را خروج آن را خراج　　　درمیان این دو سنگ آدم زجاج
این به علم و دین و فن آرد شکست　　　آن برد جان را ز تن نان را ز دست
غرق دیدم هر دو را در آب و گل　　　هر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلی تخم دلی انداختن

زنده رود

زورق ما خاکیان بی ناخداست　　　کس نداند عالم قرآن کجاست

افغانی

عالمی در سینهٔ ما گم هنوز　　　عالمی در انتظار قم هنوز

عالمی بے امتیاز خون و رنگ شام او روشن تر از صبح فرنگ

عالمی پاک از سلاطین و عبید چوں دل مومن کرانش ناپدید

عالمی رعنا که فیض یک نظر تخم او افگند در جان عمرؓ!

لایزال و وارداتش نو بنو برگ و بارِ محکماتش نو بنو

باطنِ او از تغیر بے غمے ظاهر او انقلاب هر دمے

اندرون تست آن عالم نگر

می دهم از محکمات او خبر!

محکماتِ عالمِ قرآنی

۱۔ خلافتِ آدم

در دو عالم هر کجا آثار عشق ابنِ آدم سرّے از اسرار عشق

سرِ عشق از عالم ارحام نیست او ز سام و حام و روم و شام نیست

کوکبِ بے شرق و غرب و بے غروب در مدارش نے شمال و نے جنوب

حرفِ انی جاعلٌ تقدیر او از زمیں تا آسماں تفسیر او!

مرگ و قبر و حشر و نشر احوال اوست نور و نارِ آں جهاں اعمال اوست!

او امام و او صلوٰت و او حرم او مداد و او کتاب و او قلم!

خرده خرده غیب او گردد حضور بے حدود او را نه ملکش را ثغور

از وجودش اعتبار ممکنات اعتدال او عیار ممکنات

من چه گویم از یم بے ساحلش غرق اعصار و دهور اندر دلش

آنچه در آدم بگنجد عالم است آنچه در عالم نگنجد آدم است!

آشکارا مهر و مه از جلوتش نیست ره جبریل را در خلوتش

برتر از گردوں مقام آدم است

اصل تہذیب احترام آدم است

زندگی اے زندہ دل دانی کہ چیست | عشق یک بیں در تماشائے دوئی است

مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند | کائناتِ شوق را صورت گر اند!

زن نگہ دارندۂ نار حیات | فطرت او لوح اسرار حیات

آتش ما را بجانِ خود زند | جوہر او خاک را آدم کند

در ضمیرش ممکنات زندگی | از تب و تابش ثبات زندگی

شعلۂ کز وے شررہا در گسست | جان و تن بے سوزِ او صورت نبست

ارج ما از ارجمندی ہائے او | ما ہمہ از نقشبندی ہائے او!

حق ترا داد است اگر تاب نظر

پاک شو قدسیت او را نگر

اے ز دینت عصر حاضر بردہ تاب | فاش گویم با تو اسرار حجاب

ذوق تخلیق آتشے اندر بدن | از فروغ او فروغ انجمن

ہر کہ بردارد ازیں آتش نصیب | سوز و ساز خویش را گردد رقیب

ہر زماں بر نقش خود بندد نظر | تا نگیرد لوح او نقش دگر

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید | مدتے جز خویشتن کس را ندید

نقش ما را در دل او ریختند | ملتے از خلوتش انگیختند

می توانی منکر یزداں شدن | منکر از شانِ نبی نتواں شدن

گرچہ داری جان روشن چوں کلیم | ہست افکار تو بے خلوت عقیم

از کم آمیزی تخیل زندہ تر

زندہ تر جویندہ تر یابندہ تر

علم و ہم شوق از مقامات حیات | ہر دو می گیرد نصیب از وارداد

علم از تحقیق لذت می برد   عشق از تخلیق لذت می برد
صاحب تحقیق را جلوت عزیز   صاحب تخلیق را خلوت عزیز
چشمِ موسیٰ خواست دیدار وجود   این همه از لذت تحقیق بود
لن ترانی نکته ها دارد دقیق   اندکے گم شو درین بحر عمیق
هر کجا بے پرده آثار حیات   چشمه زارش در ضمیر کائنات
در نگر هنگامهٔ آفاق را   زحمت جلوت مده خلاق را

حفظ نقش آفریں از خلوت است
خاتم او را نگیں از خلوت است

۲۔ حکومتِ الٰهی

بندهٔ حق بے نیاز از هر مقام   نے غلام او را نه کس را غلام
بندهٔ حق مرد آزاد است و بس   ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راه و دین و آئینش ز حق   زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق
عقل خود بیں غافل از بهبود غیر   سود خود بیند نه بیند سود غیر
وحی حق بینندهٔ سود همه   در نگاهش سود و بهبود همه
عادل اندر صلح و هم اندر مصاف   وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف[1]
غیر حق چوں ناهی و آمر شود   زور ور بر ناتواں قاهر شود

زیر گردوں آمری از قاهری است
آمری از ماسوی الله کافری است

قاهر آمر که باشد پخته کار   از قوانین گرد خود بندد حصار

---

[1] نه رعایت کند نه خوف از کسے دارد۔

جرّه شاهین تیز چنگ و زود گیر — صعوه را در کارها گیرد مشیر

قاهری را شرع و دستوری دهد — بی‌بصیرت سرمه با کوری دهد!

حاصل آئین و دستور ملوک

ده خدایان فربه و دهقاں چو دوک

وائے بر دستور جمهور فرنگ — مرده‌تر شد مرده از صور فرنگ

حقه بازاں چوں سپهر گرد برد — از امم بر تخته خود چیده نرد

شاطراں ایں گنج ور آں رنج بر — هر زماں اندر کمیں یک دگر،

فاش باید گفت سرّ دلبراں — ما متاع و ایں همه سوداگراں!

دیده‌ها بے نم ز حُبّ سیم و زر — مادراں را بارِ دوش آمد پسر

وائے بر قومے که از بیم ثمر — می‌برد نم را ز اندام شجر!

تا نیارد زخمه از تارش سرود — می‌کشد نازاده را اندر وجود!

گرچه دارد شیوه‌هائے رنگ رنگ — من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

اے به تقلیدش اسیر آزاد شو

دامن قرآں بگیر آزاد شو،

۳- ارض ملک خدا است

سرگذشتِ آدم اندر شرق و غرب — بهر خاکے فتنه‌هائے حرب و ضرب!

یک عروس و شوهر او ما همه — آں فسوں‌گر بے همه هم با همه!

عشوه‌هائے او همه مکر و فن است — نے از آن تو نه از آں من است!

ده نسازد با تو سنگ و حجر — ایں ز اسبابِ حضر تو در سفر!

اختلاط خفته و بیدار چیست؟ — ثابتے را کار با سیار چیست؟

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاع بے بها مفت است مفت

ده خدایا! نکته‌ای از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
صحبتش تا کے تو بود او نبود — تو وجود او نمودِ بے وجود
تو عقابی طائف افلاک شو — بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

باطن الارض للہ ظاہر است
ہر کہ این ظاہر نہ بیند کافر است

من نگویم درگذر از کاخ و کوے — دولتِ تست این جہان رنگ و بوے
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر — صید چون شاہین ز افلاکش بگیر
تیشۂ خود را بکہسارش بزن — نورے از خود گیر و نارش بزن
از طریقِ آذری بیگانہ باش — بر مراد خود جہان نو تراش
دل برنگ و بوے و کاخ و کو مدہ — دل حریم اوست جز با او مدہ !
مردن بے برگ و بے گور و کفن — گم شدن در نقرۂ فرزند و زن!
ہر کہ حرفِ لا الہ از بر کند — عالم را گم بخویش اندر کند

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست
فقر سلطانی است رہبانی کجاست

۵ حکمت خیر کثیر است

گفت حکمت را خدا خیر کثیر — ہر کجا این خیر را بینی بگیر
علم حرف و صوت را شہپر دہد — پاکی گوہر بہ ناگوہر دہد
علم را بر اوج افلاک است رہ — تا ز چشم مہر برکند نگہ
نسخۂ او نسخۂ تفسیر کل، — بستۂ تدبیر او تقدیر کل
دشت را گوید حبابے دہ دہد — بحر را گوید سرابے دہ، دہد!
چشم او بر وارداتِ کائنات — تا ببیند محکمات کائنات

دل اگر بندد بحق پیغمبری است — ور ز حق بیگانه گردد کافری است

علم را بے سوز دل خوانی شر است — نور او تاریکی بحر و بر است

عالمی از غاز او کور و کبود — فرودینش برگ ریز هست و بود

بحر و دشت و کوهسار و باغ و راغ — از بم طیارهٔ او داغ داغ

سینهٔ افرنگ را نارے ازوست — لذت شبخون و یلغار ازوست

سیر واژونے دهد ایام را — می برد سرمایهٔ اقوام را

قوتش ابلیس را یاری شود — نور نار از صحبت ناری شود

کشتن ابلیس کارے مشکل است — زانکه او گم اندر اعماق دل است!

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتهٔ شمشیر قرآنش کنی

از جلال بے جمالے الاماں — از فراق بے وصالے الاماں

علم بے عشق است از طاغوتیاں — علم با عشق است از لاهوتیاں!

بے محبت علم و حکمت مردهٔ — عقل تیرے بر هدف ناخوردهٔ

کور را بیننده از دیدار کن

بولهب را حیدر کرار کن

زنده رود

محکماتش وانمودی از کتاب — هست آں عالم هنوز اندر حجاب!

پرده را از چهره نکشاید چرا — از ضمیر ما بروں ناید چرا

پیش ما یک عالم فرسوده است — ملت اندر خاک او آسوده است

رفت سوز سینهٔ تاتار و کرد

یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد

افغانی

از حدیثِ مصطفیٰؐ داری نصیب — دینِ حق اندر جہاں آمد غریب[1]

با تو گویم معنیِ ایں حرف بکر — غربت دیں نیست فقر اہلِ ذکر

بہرِ آں مردے کہ صاحب جستجو است — غربت دیں ندرت آیاتِ اوست

غربت دیں ہر زماں نوعِ دگر — نکتہ را دریاب اگر داری نظر

دل بآیات مبیں دیگر بہ بند — تا بگیری عصر نو را در کمند!

کس نمی داند ز اسرارِ کتاب — شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب

روسیاں نقش نوی انداختند — آب و ناں بردند و دیں درباختند!

حق بہ بیں حق گوئے و غیر از حق مجوئے

یک دو حرف از من بآں ملت بگوئے

پیغامِ افغانی با ملتِ روسیہ

منزل و مقصود قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است!

در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفیٰؐ در سینۂ او زندہ نیست!

بندۂ مومن ز قرآں بر نخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد!

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست!

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت،

از ملوکیت نگہ گردد دگر،

عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر!

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی

---

[1] تلمیح بحدیث الاسلام جاء غریب الخ

ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں / قیصریت را شکستی استخواں

تا برافروزی چراغے در ضمیر / عبرتے از سرگزشت ما بگیر

پائے خود محکم گذار اندر نبرد / گرد ایں لات و ہبل دیگر مگرد

ملتے می خواہد ایں دنیائے پیر / آنکہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر!

باز می آئی سوئے اقوام شرق / بستۂ ایام تو با ایام شرق

تو بجاں افگندۂ سوزِ دگر / در ضمیر تو شب و روزے دگر!

کہنہ شد افرنگ را آئین و دیں / سوئے آں دیرِ کہن دیگر مبیں

کردۂ کار خداونداں تمام / بگذر از لا جانب الّا خرام

در گذر از لا اگر جوئندۂ / تا رہ اثبات گیری زندۂ

اے کہ می خواہی نظام عالمے
جستہ اور را اساس محکمے

داستان کہنہ شستی باب باب / فکر را روشن کن از ام الکتاب

با سیہ فاماں ید بیضا کہ داد؟ / مژدۂ لا قیصر و کسریٰ کہ داد؟

در گذر از جلوہ ہائے رنگ رنگ / خویش را دریاب از ترکِ فرنگ!

گر ز مکر غربیاں باشی خبیر / روبہی بگذار و شیری پیشہ گیر

چیست روباہی تلاش ساز و برگ / شیر مولا جوید آزادی و مرگ

جز بقرآں ضیغمی روباہی است / فقر قرآں اصل شاہنشاہی است

فقر قرآں اختلاطِ ذکر و فکر / فکر را کامل ندیدم جز بذکر

ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب / کار جان است ایں نہ کار کام و لب

خیزد از وے شعلہ ہائے سینہ سوز / با مزاج تو نمی سازد ہنوز!

اے شہید شاہد رعنائے فکر

با تو گویم از تجلی ہائے فکر

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ / دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ!

ہیچ خیر از مردکِ زر کش مجو / لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن! / کس نداند لذتِ قرضِ حسن!

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ / آدمی درّندہ بے دنداں و چنگ!

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست / ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

بندۂ مومن امیں، حق مالک است / غیرِ حق ہر شئی کہ بینی ہالک[1] است

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں / قریہ ہا از دخلِ شان[2] خوار و زبوں

آب و ناں ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کنفسٍ واحدہ"[3]

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست / نقشہائے کاہن و پاپا شکست!

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است / ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود / جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں / زندہ و پایندہ و گویاست ایں

اندرو تقدیر ہائے شرق و غرب / سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ / ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ[4]

---

[1] ہالک۔ تلمیح بآیۂ شریفہ کل شیئ ہالک الا وجہہ۔

[2] قریہ ہا از دخل الخ تلمیح بآیۂ شریفہ ان الملوک اذا دخلوا الخ

[3] کنفس واحدۃ تلمیح بآیۂ شریفہ ما خلقکم ولا بعثکم۔

[4] تلمیح بآیۂ شریفہ ویسئلونک ماذا ینفقون الخ۔

آفریدی شرع و آئینے دگر اندکے با نور قرآنش نگر

از بم و زیر حیات آگہ شوی
ہم ز تقدیر حیات آگہ شوی

محفل ما بے مے و بے ساقی است ساز قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر آسماں دارد ہزاراں زخمہ در
ذکر حق از امتاں آمد غنی از زمان و از مکاں آمد غنی!
ذکر حق از ذکر ہر ذاکر جدا است احتیاج روم و شام او را کجا است
حق اگر از پیش ما بر دارد ش پیش قومی دیگرے بگذارد ش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن ہر زماں جانم بلرزد در بدن!

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتش خود بر دل دیگر زنند!
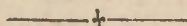
مکاتیب جمال الدین

ناصرالدین شاہ قاچار کے نام

(۱)

نجد اور قطیف جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ صنیع الدولہ (اعتماد السلطنت) نے بادشاہ سلامت کے حکم کے مطابق مجھے دارالخلافت آنے کی دعوت دی حکم کی اتباع میں حاضر ہوا اور بحمداللہ باریابی کی عزت حاصل ہوئی۔ اب فرنگستان جانے کا قصد رکھتا ہوں۔ سلطان کی اجازت حاصل کرنا اپنا فریضہ جانتا ہوں اور اس کی اجازت کے حصول کے سوا میرا اور کوئی مقصد نہیں۔ البتہ جہاں کہیں رہوں گا۔ شہریار کے مقاصد عالیہ اور افکار خیریہ کا جو دین کی حفاظت اور تمام مسلمانوں کی صیانت کا موجب ہیں، اپنے آپ کو خادم اور مددگار سمجھوں گا۔ اللھم اید بائلۂ الصائبۃ ھذا الملۃ وشید بعزائمہ الثابتۃ اساس سلطنۃ ھذہ الامۃ العز، والسلام۔

جمال الدین حسینی

(۲)

"ہم نے اپنا وعدہ پورا کر کے تمام امور انجام کو پہنچا دیئے ہیں۔ اور اب میں حضرت عبدالعظیم کے خرابہ خانہ پہنچ گیا ہوں۔ شہر میں آنے اور باریاب ہونے سے پہلے اس بات کا اظہار ضروری

جانتا ہوں :۔

میں جانتا ہوں کہ اہل غرض اور مفت خوار اپنے اغراض سے دست کش نہیں ہوں گے، اور ہر روز کوشش کرتے رہیں گے اور پادشاہ سلامت خود بھی شبہات کو دور کرنے اور خائنوں کو سزا دینے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اگر آپ اپنے وعدہ میں حقیقتاً استوار ہیں اور اس پر قائم ہیں تو اجازت دیجئے کہ حاضر ہو کر باریابی حاصل کروں۔ اور اگر یہ وعدہ اور یہ دعوت بھی سابقہ دعوت کی طرح ہے تو اسی جگہ سے لوٹ جانے کی اجازت دیجئے۔ تاکہ اہل غرض پھر اپنی کوششوں کا اعادہ کریں اور نہ اعلیٰحضرت وعدہ خلافی اور بدعہدی کے لئے دنیا میں مشہور رہوں والسلام

جمال الدین

(۳)

اپنے وعدے پر قائم رہنے اور مراحم خسروانہ کے لئے نہایت شکر گزار ہوں۔ میں صدر اعظم کے پاس نہیں ٹھیروں گا، یہاں میرے ٹھیرنے کے لئے متعدد مقامات ہیں۔ حاجی محمد محسن میرے دوستوں میں سے ہیں۔ میں پہلے بھی ان کے پاس ٹھیر چکا ہوں۔ خواہش مند ہوں اس دفعہ بھی وہیں ٹھیروں۔

(۴)

عرضداشت بسدہ عالیہ عتبہ رفیعہ سامیہ اعلیٰحضرت شہنشاہ اسلام پناہ۔

میونخ میں جب مجھے شرف نیاز حاصل ہوا اور میں مرکب ہمایونی کے ہمرکاب ہوا تو اس دوران میں جناب امین السلطنت وزیر اعظم نے یہ مناسب سمجھا کہ اس عاجز کو بعض امور ضروریہ کے لئے پیٹرس بورغ (پیٹرس برگ) بھیجا جائے اور پھر اس کام کو انجام دیکر میں ایران آؤں۔ اعلیٰحضرت نے بھی اس تجویز کو پسند فرمایا۔ اسی شب کو وزیر اعظم نے مجھ سے پانچ گھنٹے گفتگو کی، اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تو دولتِ روسیہ اور وہاں کے

اخبار نویسیوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وزیر اعظم کو نشانۂ اعتراضات بنائیں اور اُن کی
مخالفت کریں۔ اس لئے کہ وہ یعنی وزیر اعظم مالک و صاحب ملک نہیں ہیں اور معاملات کی
بست و کشاد ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ دویم یہ کہ مسئلہ کاروں موجودہ وزیر اعظم کے
اس عہدے پر تقرر سے پہلے طے ہوچکا تھا حتی کہ اس مسئلہ کے صرف بعض اجزا بدقسمتی سے
ان کی وزارت کے زمانے میں انجام پائے ہیں پس پیٹرس برگ پہنچ کر وزارت روسیہ کو
سمجھانا چاہیئے اور بتانا چاہیئے کہ وزیر اعظم کے متعلق وزارت روسیہ کے افکار فاسد
ہیں۔ ان کو رفع کرنا اور نیک خیالات پیدا کرنے چاہیئں۔ نیز وزیر اعظم نے اس عاجز سے
یہ بھی خواہش کی کہ رئیس الوزرا موسیو کیرس اور وزیر خارجہ ویلنکالے اور ایتوف وغیرہ کو
سمجھاؤں کہ وزیر اعظم ان کے مقاصد کے پورا کرنے کے لئے بہر حال حاضر ہیں! ور
اگر روس کی طرف سے خواہش ہو تو جلد ان مسائل کو حل کردیں۔ اور حالات سابقہ پر
اعادہ ہوجائے۔ چونکہ یہ عاجز وزیر اعظم کے مقاصد کو عین رضائے پادشاہ اور خیر ملت اسلام
سمجھتا تھا اس لئے سینٹ پیٹرزبرگ گیا اور چند اشخاص سے گفتگو کی جن کو سیاسیات
مشرق میں اپنا ہم مشرب سمجھتا تھا۔ مثلاً حربیہ کے جنرل ایروجیف، جنرل ونجتر وزیر دربار،
جنرلِ اغتاتیف سفیر سابق روس در اسلام بول و مادام نوویکف جو بااثر خاتون ہیں۔ ان
سب کو میں نے اپنی رائے سے متفق کرلیا۔ دو ہفتہ میں بیس دفعہ موسیو کرلیس اور ان دوسرے
اشخاص سے ملا۔ اور بتایا پہلے اس سے کہ وزیر اعظم کے مقاصد میں سعی کروں۔ یہ کوشش
کی کہ سیاسی دلائل اور اپنے ہم خیال اصحاب کی امداد سے یہ ثابت کردوں کہ دولتِ
روس کے لئے مشرق میں بہترین اصول کار یہی ہے کہ ہمیشہ دولتِ ایران سے صلح اور
اتحاد رکھے اور مخاصمت نہ کرے اور اس سلسلے میں ہمہ وقت ترکوں اور اراضی ترکمانیہ
میں اعلیحضرت کے اثرات کو ان لوگوں کے ذہن نشین کرتا رہے جب میں نے یہ سمجھ لیا
کہ یہ مطلب حاصل ہوگیا اور ان لوگوں کا غصہ بھی فرو ہوگیا۔ تب جناب وزیر اعظم کے

مقاصد کو پیش کر کے ان صاحبوں سے کہا کہ وزیر اعظم نے خود مجھ سے میونخ میں کہا ہے کہ اگر آپ کوئی طریقہ ایسا بتائیں کہ بغیر لڑائی جھگڑے کے تمام مسائل طے ہو جائیں۔ اور روس و انگلستان و ایران کے سابق تعلقات برقرار رہیں تو وہ اس کام کے لئے حاضر ہیں۔ جہاں تک ہو سکا میں نے وزیر اعظم کے مقاصد میں پوری کوشش کی چنانچہ ایک دفعہ پھر ان مطالب کو ان لوگوں کو لکھا۔ موسیو کرپس اور دیگر اصحاب سے جب دوبارہ دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اس مسئلے میں پہلے وزیر جنگ اور وزیر مالیہ اور شاہ روس سے مشورہ کر لیا جائے۔ پھر اگر کوئی سیاسی راستہ معلوم ہوگا کہ اس سے مسائل حل ہو جائیں تو ہم تم کو بتا دیں گے تاکہ تم وہی جواب وزیر اعظم کو پہنچا دو۔ البتہ اگر یہ مسائل ایسی صورت سے طے ہو جائیں کہ روس اور دولتِ ایران کے درمیان مخاصمہ پیدا نہ ہو تو بہتر ہے۔ پس آپس میں مشورہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنے اور جناب وزیر اعظم کے لئے دو سیاسی مسلک قرار دیئے اور مجھ سے کہا کہ اگر جناب وزیر اعظم چاہتے ہیں کہ آئندہ خطرات کا دروازہ بند کر دیں تو ان کے پیام کے جواب میں یہ دونوں مسلک ان کو سمجھا دو تاکہ تمام معاملات بغیر کسی جھگڑے کے ہم سب کی رضامندی کا باعث ہوں۔ یہ عاجز نہایت خوش ہوا کہ خدا کی مدد سے معاملات کو طے کر سکا اور یہ خیال کیا کہ اب میں روس کے مسلک سیاست خفیہ کو ظاہر کر کے ایک حد تک اسلامی سلطنت کی ایک خدمت انجام دے سکوں گا۔ جب طہران پہنچا تو شہر کے باہر ٹھیر کر میں نے اپنے آنے کی اطلاع جناب وزیر اعظم کو دی۔ انھوں نے میرے قیام کے لئے حاجی محمد حسن امین الضرب کا مکان پسند کیا۔ اور میں نے تین ماہ تک اپنی قیامگاہ سے حرکت نہیں کی۔ سوائے ایک دفعہ کے کہ وہ بھی ایک ماہ بعد جب اعلیٰحضرت سے ملاقات کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ اس تمام مدت میں جناب وزیر اعظم نے اس عاجز سے کوئی بات دریافت نہیں کی کہ پیٹرز برگ میں کیا ہوا اور

اس معاملہ کا کیا جواب ہے جس کے لئے میں بھیجا گیا تھا۔ اس مدت میں میں نے کئی دفعہ اپنے آدمی جناب وزیر اعظم کے پاس بھیجے! انھوں نے وعدہ بھی کیا کہ مفصل ملاقات کرینگے جب زیادہ زمانہ گزر چکا تو روس سے دریافت کیا گیا کہ ان معاملات کا کیا فیصلہ ہوا۔ میں نے اس کا یہ جواب دے دیا کہ ابھی تک وزیر اعظم سے گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ اور گفتگو نہ ہونے کا سبب بھی مجھے معلوم نہیں۔ جب وزارت روس کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ سب حیلہ سیاسی تھا، اور مقصود صرف مقابل کے تخیّلات اور ارادوں کا معلوم کرنا تھا۔ پس یہ سمجھ کر انھوں نے اپنے سفیر متعینہ طہران کو تار دیا کہ سید جمال الدین نے وزیر اعظم کی طرف سے بعض امور میں گفتگو کی تھی۔ اگر وزیر اعظم چاہتے ہیں کہ ان امور کے متعلق گفتگو کریں تو سفیر روس متعینہ طہران یا سفیر ایران متعینہ روس کے ذریعے سے مکالمہ کریں اور جمال الدین کی طرف سے جنھوں نے غیر رسمی طور پر گفتگو کی تھی۔ اب مزید گفتگو فضول ہوگی۔ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) اتنا سفر کیا۔ تکلیف اٹھائی۔ اور پھر روز اول ہی رہا۔ جو گرہ کھل گئی تھی، اس کو پھر باندھ دینا اعلیٰ حضرت بادشاہ اسلام جو طریقہ ڈپلومیسی کو ہر شخص سے بہتر جانتے ہیں، سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر غلط ہے۔ جناب وزیر اعظم کو جب وزارت روسیہ کے تار کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے بخلاف عادت سیاسین بجائے اس کے کہ اس امر پر افسوس کرتے ان مسائل کے متعلق وزرائے روس کے افکار کیوں اب تک معلوم نہیں کئے اور ان کے جواب کو کیوں اب تک نہ سنا، صاف کہہ دیا کہ میں نے وزارتِ روسیہ سے کہنے کے لئے جمال الدین سے کوئی بات نہیں کہی تھی اور نہ میں نے ان کو پیٹرس برگ بھیجا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ کیا تماشہ ہے! یہ کیا فکر عقیم ہے؟ یہ کیا نتیجۂ فاسدہ ہے۔ اگر یہی مسلک ہے تو غلطیوں کا کیونکر انسداد ہو سکتا ہے! اور کیونکر خطرات دفع کئے جا سکتے ہیں۔ بے سبب دلوں میں شبہ ڈالنا اور قلوب کو متنفر کرنا! خدائے توانا مجھے اپنی قدرت کاملہ سے

اس قسم کی حرکات سے محفوظ رکھے! اور یہ عجب واقعہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کی زبان سے
اپنی تعریف و توصیف سننے کے بعد حاجی محمد حسن امین الضرب نے مجھے بتایا کہ اعلیحضرت
کی مرضی یہ ہے کہ عاجز طہران کا قیام ترک کر کے مقابر شہر میں سکونت اختیار کرے۔
میں نے بہت اپنے ذہن میں ڈھونڈا۔ مجھے اس کا کوئی سبب معلوم نہ ہو سکا۔ کیا
اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے دولتِ روس کو دلائل و براہین سے دولتِ ایران کے
مسلک کو قبول کرنے پر آمادہ کر لیا تھا؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ وزیر اعظم کی خواہش
کے مطابق میں پیٹرس برگ گیا اور ان کے مقاصد روسیہ سے حاصل کرنے کی
کوشش کی؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ جو کچھ وزیر اعظم کی خواہش تھی اس کو جد و جہد
کر کے پورا کیا؟ مجھے تو ندامت ہونی چاہیئے کہ جو کچھ نمونہ پہلی دفعہ کی مہمانداری میں
میں نے دیکھ لیا تھا۔ اس کو کافی نہ سمجھا۔ اور پھر ایران آنے کا خیال دل میں کیا۔
مگر میں شہنشاہ کے الفاظ کو مقدس سمجھتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ میرے خلاف جو کچھ
کہا گیا ہے اس کو آپ کے علم میں لاؤں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ میں خیر خواہ اور مطیع
ہوں۔ مگر اب یہ صورت ہے کہ میرے بدخواہ یہ صاحبانِ عقول صغیرہ اور نفوس حقیرہ
یہ امید رکھتے ہیں کہ ذہن نقاد اعلیحضرت کو اس عاجز کے بارے میں پھر مشتبہ کر دیں
لہٰذا میں حضرت عبدالعظیم میں بیٹھا ہوا منتظر ہوں کہ کیا حکم صادر ہوتا ہے۔

جمال الدین حسینی

ولفرڈ بلنٹ کے نام

(۱)

پیرس - ۲۱ - اپریل ۱۸۸۴ء

جناب عالی!

آپ کا گرامی نامہ وصول ہوا، جس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور جس کا میں بہت جلد جواب دے رہا ہوں۔

اگرچہ مجھے اپنے مصر کے دس سالہ قیام میں کبھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ مسٹر گارڈن آزادی کے حامی اور اسلام کے رفیق ہیں[۱] تاہم جو بھروسہ مجھے آپ کی باتوں پر ہے اس کا خیال رکھتے ہوئے میں ان کے افسوسناک انجام پر بلا تامل اظہار ہمدردی کرتا ہوں، اور اس امر کے متعلق اپنا دلی رنج ظاہر کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسی صورت حالات میں گرفتار ہو گئے جو دن بدن نازک ہوتی جا رہی ہے۔

میں آپ سے یہ بات چھپانا نہیں چاہتا کہ اس اعتماد پر نظر رکھتے ہوئے جو مہدی اور اس کے بڑے بڑے ساتھیوں کو جن میں سے اکثر میرے سوڈانی شاگرد رہ چکے ہیں، مجھ پر ہے۔ میرے لئے یہ امر آسان تھا کہ میں اس مصیبت سے گارڈن پاشا کو رہائی دلوا دیتا جو ان پر منڈلا رہی ہے، بشرطیکہ گریہم اور عثمان دغنا کے

---

[۱] غالباً یہ اشارہ گارڈن کی اس یادداشت کی جانب ہے جو ۱۸۸۰ء میں مرتب کی گئی تھی اور جس میں سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کی تجویز درج تھی۔ اس یادداشت کی رو سے مصر انگلستان کو، شام فرانس کو، آرمینیا روس کو اور یورپین خودمختار عیسائی سلطنتوں کو تقسیم کیا جانے والا تھا۔ بلنٹ نے اپنی کتاب (گارڈن خرطوم میں) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ دیکھو ص ۲۴۸۔

درمیان آخری لڑائی نہ ہوئی ہوتی۔ لیکن اس خوفناک جنگ کے بعد جس میں بے انتہا عربی خون بہایا گیا ہے، میرا واثق خیال یہ ہے کہ مہدی اور اس کے رفقا اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ کھوئی ہوئی زمین کو از سرِ نو حاصل کرنے اور اپنا وقار جمانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خرطوم پر قبضہ کر لیا جائے۔ یا مسٹر گارڈن کو گرفتار کر لیا جائے، یا ان کی جان لے لی جائے۔

بہر حال اگر آپ مبادی صلح کے بارے میں فرانسیسی زبان میں مجھے زیادہ تفصیل لکھ کر بھیج دیں یعنی ایسی شرائط صلح جو آپ طے کرانا چاہتے ہیں۔ اور جو آپ کے نزدیک قابل پذیرائی ہو سکتی ہیں۔ تو میں آپ کے لئے ہر اس خدمت کے ادا کرنے میں قاصر نہیں رہوں گا۔ جو میں موجودہ حالات میں کر سکتا ہوں۔ اور نیز ان مؤثر ذرائع کو بہم پہنچانے میں جو بدقسمت گارڈن کی زندگی کو بچانے میں کام میں لائے جا سکتے ہیں۔

جواب کا طالب

جمال الدین حسینی افغانی

(۲)

پیرس ۲۸۔ اپریل ۱۸۸۴ء

جناب عالی!

آپ کا مراسلۂ گرامی ابھی وصول ہوا ہے۔ اسے میں نے نہایت غور کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور میں اب اس کا بہت جلد جواب لکھ رہا ہوں۔

آپ کو اس اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو عام مسلمانوں کے نزدیک مہدی کے روحانی مشن میں مضمر ہے۔ اور ساتھ ہی اس کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ وہ لفظ "مہدی" سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مفہوم غیر مسلموں سے

اسلام کو نجات دلانے والا ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مہدی سے کیونکر ایسی صلح کی جا سکتی ہے۔ اور کیونکر اس کی پیشقدمی کو روکا جا سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے انگریزوں کو مصر میں رہنے کی اجازت مل جائے لیکن اگر مبادی صلح یہ ہوں کہ مصر مصریوں کے پاس رہے۔ یہ کہ گارڈن پاشا مع اپنے عیسائی رفقا کے بچا لئے جائیں، اور یہ کہ انگریزی افواج مصر سے ہٹائی جائیں تو اس صورت میں میرا خیال ہے کہ اس معاملہ کو خوشگوار انجام تک پہنچانا ممکن ہو سکے گا۔ اگرچہ یہ کام بالکل آسان نہیں ہے۔ اس سے مہدی کے حملے کو بھی ایک وقت خاص تک روکا جا سکتا ہے اور خاص جگہ تک محدود کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہوگا کہ اس کا وفد جس میں زیادہ تر مسلمان اور چند انگریز ہوں۔ مہدی کی خدمت میں بھیجا جائے۔ مسلمانوں کو یہ کہنے کی ہدایت کر دی جائے کہ ہم مصر کی اسلامی قوم کی طرف سے آئے ہیں۔ اس لئے کہ اگر انھیں مصری حکومت کی جانب سے بھیجا جائے گا تو مجھے یقین نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے۔ کیونکہ مہدی کو انگریزی حکومت سے نفرت ہے اور چونکہ وہ انگریزی حکومت کے نمائندے ہوں گے، اس لئے ان کی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔ شیخ المرغانی کے ذریعہ ہمیں اس کا کافی ثبوت مل چکا ہے۔ باقی رہا ان انگریزوں کا مسئلہ جو اس مشن کے رکن ہونگے تو اس کے متعلق یہ اچھی طرح سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ اپنی حکومت کے افسر ہوں گے۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ تمام اشخاص خواہ مسلمان ہوں یا عیسائی انگریزی مشن کے رکن ہوں گے۔ اگر اس مشن کو بھیجنے کا فیصلہ ہو گیا۔ اور ان حالات میں جن کے بیان کرنے کی میں آپ کے روبرو جرأت کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مشن کے سب سے پہلے رکن نامزد کئے جائیں گے کیونکہ مسلمانوں کو آپ جیسا حامی و مددگار میسر نہیں آسکتا باقی رہے وہ مسلمان جن کا بھیجنا ضروری سمجھا جائے گا۔ سو میں ان کے نام بتا دوں گا

اور آپ ان ناموں کو عین موقع پر ظاہر کر دیں جب کہ خاص طرز عمل کے متعلق فیصلہ نہ ہو چکا ہو
آپ مجھ سے استفسار کرتے ہیں کہ توفیق پاشا کی جگہ پر کس شخص کو مقرر کرنا چاہیئے
میرا جواب یہ ہے کہ جب موقع آئے گا تو آپ کے لئے کسی جانشین کا معلوم کر لینا مشکل نہ ہوگا۔ وہ شخص وہی ہو گا جسے مصری قوم چاہتی ہے۔ اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

آپ کا محب صادق

جمال الدین حسینی افغانی

(۳)

پیرس۔ ۷۔ مئی ۱۸۸۴ء

جناب عالی!

میں ابھی اطالیہ سے آیا ہوں، میوُرن کی نمائش میں بھی گیا تھا۔ آج صبح آپ کی دو چٹھیاں مجھے وصول ہوئی ہیں۔ جنھیں میں نے نہایت غور کے ساتھ پڑھا ہے آپ کے آخری خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ گارڈن کے انجام سے زیادہ سروکار نہ رکھیں گے، اور اس سے ایک مرتبہ اور آپ کی روح کی عظمت اور وفاداری کا نقش میرے دل پر بیٹھ گیا ہے۔ آپ کی اس دلی خواہش کا کہ آپ جنرل گارڈن کے متعلق خط و کتابت والی "بلو بک" مجھے بھیجنا چاہتے ہیں۔ جس کی مدد سے آپ نے بلاشبہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ جنرل موصوف آزادی کے حامی یا اسلام کے محافظ نہ تھے شکریہ ادا کرتے ہوئے میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ آپ کا اسم گرامی ہر مسلمان کے دل میں خصوصاً اور ہر عرب یا مشرقی کے دل میں عموماً نقش رہے گا۔ اس لئے کہ جو دلچسپی آپ ان کے معاملات میں لے رہے ہیں، وہ ایسی ہے کہ وہ مشکور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی مخصوص رواداری کے ساتھ اسی شاندار راستے پر

گامزن رہیں گے اور یہ کہ خدائے برتر اس محنت کا اجر آپ کو دے گا۔ جو آپ ان
ان کے لئے کر رہے ہیں۔

براہِ کرم میڈم بلنٹ کی خدمت میں میرا اسلام نیاز پہنچا دیجئے! اور یقین رکھیئے
کہ میری خدمات ہر وقت آپ کے لئے حاضر ہیں۔

آپکا صادق

جمال الدین حسینی افغانی

(۴)

پیرس۔ ۱۲۔ مئی ۱۸۸۵ء

سلام کے بعد میں ہی صرف آپ کی ان نمایاں کوششوں کا مرہون
منت نہیں ہوں جن کی وجہ سے گورنمنٹ سوڈان کا علاقہ خالی کر دینے پر مجبور ہو گئی ہے
نہیں یقین رکھیئے کہ تمام مسلمان خصوصاً عرب آپ کے اس کارنامے پر تہ دل شکر گزار ہیں
اور آپ کی سرگرمی اور جرأت کے معترف ہیں۔ آپ کا اسم گرامی قیمتی پتھروں کے حروف
میں لوح پر لکھا جائے گا اور عزت و احترام کے تمام القاب سے مزین کیا جائے گا۔

لیکن ابھی تک ایک کام ایسا ہے جو باقی رہ گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ
گورنمنٹ سے کہیں کہ 'مہدی سے عہد نامہ کئے بغیر کس طرح سے اس سرزمین کو خالی
کیا جا سکتا ہے، اور یہ کہ مہدی کے حملوں کو روکنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے
ساتھ ہی یہ کہ گورنمنٹ تجارت کے شاہراہوں کو کس طرح مسدود رکھنے کی اجازت دے
سکتی ہے؟ کیا ایسی حالت میں جب کہ گورنمنٹ نے سوڈان خالی کر دینے کا فیصلہ
کر لیا ہے، گورنمنٹ پر واجب نہیں کہ وہ کسی قابل اعتماد شخص کو مہدی کے پاس
شرائط صلح مرتب کرنے کی غرض سے بھیجے اور مصر کو اس کے حملوں سے بچائے
اور اس طرح قتل و خوں ریزی کو بند کرائے اور تجارتی راستوں کو کھلوائے مزخیال ہے کہ

اگر یہ سوال پارلیمنٹ کے روبرو پیش کیا جائے گا تو سب رکن اس سے اتفاق رائے ظاہر کریں گے۔

مجھے یہ کام آسان معلوم ہوتا ہے، اور یہ کہ اخراجات طے ہو جانے کے بعد اس کام کی تکمیل کے لئے آپ ہی کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن مہدی سے صلح کئے بغیر صورت حالات کبھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وہ بات ہے جس کا آپ تک پہنچانا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

آپ کو اور آپ کی بیگم صاحبہ کو سلام پہنچے۔

آپ کا دوست

جمال الدین حسینی افغانی

(۵)

پیرس، ۱۷ جولائی ۱۸۸۵ء

جناب عالی!

میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ موجودہ وزارت کی حکمتِ عملی بھی مصر اور سوڈان کے معاملے میں کچھ گزشتہ وزارت کی سی ہے۔ میٹھے اور خوشگوار وعدوں سے بھوک کب رفع ہوتی ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں مصر کا مسئلہ افغانستان کے مسئلہ پر منحصر ہے اور افغانستان کا معاملہ تمام تر میرے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے میں نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ آئندہ ہفتے افغانستان چلا جاؤں اور میرے جانے سے انشاء اللہ آپ کا مقصد بھی پورا ہوگا۔ عنقریب میں آپ کو اپنی کارگزاری سے مطلع کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ اس وقت تک اپنے تک ہی رکھیئے گا۔ جب تک کہ ہم کسی مفید نتیجے پر نہ پہنچ جائیں۔ مجھے امید ہے کہ خط و کتابت کا یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ غالباً سہ شنبہ کو میں روانہ ہو جاؤں گا۔۔۔۔۔۔۔

آپ کا محب صادق

جمال الدین حسینی افغانی

(۶)

پیرس - ۱۸ - جولائی ۱۸۸۵ء

جناب عالی!

۱۷ جولائی یوم جمعہ کو ایک عریضہ ارسال خدمت کر چکا ہوں جس میں میں نے اپنے عزم و ارادہ سے جناب کو مطلع کر دیا تھا - آج ۱۸ - جولائی کو آپ بیگم صاحبہ کا ایک عنایت نامہ وصول ہوا جس میں مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں پھر لندن آؤں - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے آنے سے حقیقتاً کیا فائدہ مرتب ہو گا - مفت میں میں آپ کے پاس آؤں نتیجہ کچھ بھی نہ نکلے - مجھے کچھ فائدہ ہو نہ آپ کو - ہاں زحمت مجھے اور آپ کو دونوں کو ہو تو اس سے حاصل کیا - اور اگر آپ بھی صورتِ حالات سے ناواقف ہوں اور موجودہ وزارت پر بھی آپ کو اعتماد نہ ہو تو مجھے لکھیئے گا - تاکہ میں اپنے ارادے کو عمل میں لا سکوں یعنی افغانستان روانہ ہو جاؤں - جیسا کہ اپنے گزشتہ خط میں لکھ چکا ہوں ....

آپ کا صادق

جمال الدین حسینی افغانی

سید ہادی جان کے نام

سید ہادی جان!

تمہارا مکتوب معانی اور الفاظ کا ایسا باغ تھا جس میں ہرے بھرے درخت رنگ برنگی پھولوں سے لدے ہوئے تھے - لیکن صد حیف کہ ان درختوں کے نیچے کسے

راستے قبروں سے، مردوں سے اور خون کے سیلاب اور سڑے ہوئے اعضا سے ایسے پٹے ہوئے تھے کہ ان کی طرف دیکھنا موجب کراہت اور اس کا تصور کرنا سبب نفرت ہوتا ہے۔ یہاں سے اٹھنے والی بدبو اس کے انوار اور کلیوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے سے مشامہ کو باز رکھتی ہے۔ والسلام۔

[نوٹ:۔ سید ہادی جان، بقول لطف اللہ۔ سید کے پھوپی زاد بھائی تھے انھوں نے سن ۱۳۰۱ھ کے قریب جب کہ سید پیرس میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ یہ لکھا تھا کہ آپ اپنی ساری سیاسی مصروفیات سے دستبردار ہو جائیے کہ اس میں آپ کی جان کا خطرہ ہے۔ سید نے اس کا یہ جواب دیا ہے۔]

لطف اللہ کے نام

(۱)

نور دیدہ لطف اللہ!

تمہارا خط جو تمہاری حسنِ طبیعت طہارت سیرت، لیاقتِ ذات اور استعدادِ فطرت کا کاشف تھا۔ ملا۔ میں بہت خوش ہوا۔ خصوصاً اس عبارت سے جو تشبیہات انیقہ اور استعارات بدیعہ کے ساتھ نہایت مربوط اور نہایت سلجھی ہوئی تھی۔ آفریں ہے تم پر۔ جوانوں کے لئے ادب زینت اور کمال زیور ہے۔ یہاں اسی پر میں اکتفا کرتا ہوں۔ درجات کمال کی کوئی حد نہیں۔ لیکن اس کے باوجود کسی حد پر قناعت کرنا دون ہمتی اور پستی فطرت ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ تم مجھ سے ملنے کے لئے پیرس آنا چاہتے ہو۔ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ تمہیں چاہئے کہ مطیع رہو، اور اطاعت امر کرو۔ یہ موقع مناسب نہیں، جب مناسب وقت دیکھوں گا تمہیں بلالوں گا۔ اور اگر تم نے

خلافِ امر کام کیا، اور یہاں چلے آئے تو عظمتِ حق کی قسم تم پیرس میں رہ کر بھی میری صورت نہ دیکھ سکو گے۔

یارانِ زندم کو میرا سلام پہنچانا۔ مکارمِ اخلاق ناصری کا مطالعہ کرتے رہو

جمال الدین حسینی

(۲)

ستارہ بدرخشید و ماہ مجلس شد دل رمیدۂ ما را انیس و مونس شد

صبح کا وقت تھا۔ نیند سے جاگا، دیکھا کہ ہوا سرد ہے۔ اور برف آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی ہے۔ جلدی سے وضو کیا اور اپنے کمرے میں گھس کر لحاف لپیٹ لیا۔ ذرا گرم ہو کر نماز پڑھی۔ دوسری بار رہ نہ سکا۔ لحاف میں گھس کر طلوع آفتاب تک فرش پر بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اٹھا اور "شرب شاہی" پی کر سگار کے دم لگاتا رہا جب انگیٹھی سلگائی گئی اور آفتاب بلند ہوا تو گھر سے باہر نکلا اور بعض دوستوں سے ملنے چلا گیا۔

اذا نسب الطائی بالبخل مادر

وعیر قا بالفھامۃ باقل

وقال السھا للشمس انت خفیۃ

وقال الدجی للصبح کاجل

وطالت الارض السماء ترفعا

وفاخرت الشعب الحصا والجبال

فیاموت ذر ون الحیوۃ ذمیمۃ

ویا نفس حدی ان دھرک ھازل

توکلت علی الذی لایموت وسبحان الذی لم یتخذ صاحبۃ ولا ولدا۔

تفسیر صافی کی ایک جلد والد مکرم معظم ذوالفضائل جناب آقا صفدر سلمہ اللہ کی خدمت میں روانہ ہے۔ انشاء اللہ الرحمٰن اپنے اس بندے کو دعائے خیر سے محروم نہ فرمائیں گے

تصحیح ۲

جمال الدین حسینی السعد آبادی

مجتہد اعظم حاجی مرزا حسن کرمانی کے نام

(انیسویں صدی کا ربع آخر ایران کی تاریخ کا نہایت تاریک زمانہ تھا۔ ایرانی بربادی اور ذلت کی آخری منزل پر پہنچ چکے تھے۔ ناصرالدین شاہ کی حکومت اہل ایران پر ایک عذاب کی طرح مسلط تھی اس کو یورپ کی ادنیٰ دلچسپیوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اور قوم کی ساری دولت یورپ کے قہوہ خانوں اور بازاروں میں لٹائی جا رہی تھی۔ ۱۸۸۹ء میں ناصرالدین شاہ تیسری دفعہ یورپ گیا۔ اس سے پہلے وہ ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۸ء میں یورپ کی سیاحی کر چکا تھا۔ ان مغربی سیاحتوں نے اس کا خزانہ خالی کر دیا، اور خزانہ خالی ہونے کے بعد مصر کی طرح ایران میں بھی یورپی دول کی دوستانہ مداخلت کے بہت سے مواقع پیدا ہو گئے جس طرح خدیو اسمٰعیل کی فضول خرچیوں نے مصر کو یورپی ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا تھا۔ اسی طرح اب ناصرالدین شاہ اپنے باپ دادا کی وراثت کو سب سے بڑی بولی بولنے والے کے ہاتھ بیچ کرنے پر تیار تھا۔ مغربی ساہوکار ہمیشہ اپنے ایسے بیوقوف اور عیش پرست مشرقی تاجداروں کو اپنا قرض دار بنانے کے لئے بخوشی تیار رہتے ہیں۔ انھوں نے ناصرالدین شاہ کی

مالی دشواریوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور دوستوں کے بھیس میں آکر
شاہ کو اپنے ملک کا خون چوسنے کے مؤثر ذرائع بنانے شروع کئے
اکتوبر ۱۸۸۹ء میں شاہ یورپ سے واپس آیا اور اس کے آنے
کے بعد برطانیہ اور روس کے لئے مراعات کے دروازے پہلے
سے زیادہ کھول دیئے گئے۔ مثلاً اہواز سے طہران تک سڑک
بنانے کا ٹھیکہ خاص حقوق کے ساتھ ایک برطانوی کمپنی کو دیا
گیا۔ ملک کی معدنیات یورپی ٹھیکہ داروں کے سپرد کی گئی، ایک
شاہی بنک قائم کرنے کی اجازت انگریزوں کو دی گئی۔ روسی
پرنس ڈولگروکی کو ریلوں کا اجارہ دیا گیا۔ ایک اور یورپی
کمپنی کو لاٹری قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔ مراعات کے
اسی سلسلے میں تمام ملک کے تمباکو کی پیداوار کا ٹھیکہ دے دیا
گیا۔ اور اسی مشہور ٹھیکے سے ایرانی انقلاب شروع ہوتا ہے۔

اہلِ ایران پہلے ہی سے ان مصائب سے نالاں تھے،
شیخ کے ایران میں موجود ہونے نے ان میں بیداری اور احتجاج کی
ایک لہر دوڑا دی، جو چیز دلوں میں تھی زبان پر آنے لگی، اور رفتہ
رفتہ قوم کی بے چینی اپنا اثر دکھانے لگی، ناصرالدین کی حکومت
نے سب سے پہلے شیخ کو ایران سے خارج کیا لیکن ایران سے خارج
ہو کر شیخ نے جو خط لکھا اور ملکم خاں نے اپنے رسالہ "قانون" کے ذریعے
اس کی جو مخالفت کی وہ رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔

غرض تمباکو کے اجارے کا مسئلہ گویا ایک کنجی تھا جس
نے شاہ کے خلاف رنج اور غصے کے دروازے کھول دیئے۔

شیخ اس وقت ایران سے خارج ہو کر بصرہ میں حاجی علی اکبر شیرازی
تاجر کے مہمان تھے، وہیں بیٹھ کر ایران کے حالات پر انھوں نے
اپنا وہ مشہور تاریخی خط مجتہد اعظم حاجی مرزا حسن شیرازی کے نام (جو
سامرہ میں مقیم تھے) لکھا اور حاجی علی اکبر کی وساطت سے روانہ کیا۔
یہ خط بعد میں ضیاء الخافقین (لندن) سے شائع کیا گیا۔ اور تمام تمام
علماء اور مجتہدین کی خدمت میں بھیجا گیا۔ یہ خط شعلہ بن کر بارود خانے
میں گرا اور ایران کے ہر گوشے میں آگ لگ گئی۔

اس خط کے جواب میں مجتہدین نے جو فتوی شائع کیا
وہ صرف ایک سطر کا فتوی تھا:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ آج سے تمباکو کا استعمال کسی
صورت میں ہو امام وقت سے بغاوت کرنے کا مترادف ہے۔"

یہ ایک سطر تھی جس نے ایران اور شاہ ایران کی قسمت کا
فیصلہ کر دیا۔ بقول براؤن ایک دن صبح جب شاہ نے حسب معمول
اپنے محل میں قلیان طلب کیا تو خدام نے عرض کیا کہ محل میں
تمباکو کا ایک پتہ بھی موجود نہیں۔ فتوی کی اتباع میں سب ضائع کر دیا گیا

یہ خط عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔ براؤن
نے اپنی کتاب "انقلاب ایران" میں اس کا پورا انگریزی ترجمہ دیا ہے، چونکہ یہ
شیخ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ اور ان کا ایک اہم بالشان کارنامہ ہے۔
اس لئے ہم ذیل میں اس کا پورا اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں سچ کہتا ہوں کہ یہ خط شریعتِ اسلامی کی خاطر لکھتا ہوں، جہاں

کہیں وہ شریعت جاری اور قائم ہو۔ یہ ایک ہدیہ ہے جو امت اسلامیہ نفوسِ زکیہ کی خدمت میں پیش کر رہی ہے جو شریعت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کو نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ علماء ہیں اور میں اس خط کے مضمون کو سب پر پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ اس وقت میرا مخاطب ان میں سے ایک ہی ہے۔

خبیر الامۃ بارقۃ انوار الائمۃ، دعامۃ العرش الدین واللسان الناطق عن الشرع المبین جناب الحاج المیرزا محمد حسن الشیرازی صان اللہ بہ حوزۃ۔

خُدا نے آپ کو اس اعلیٰ نیابت پر فائز کیا ہے کہ آپ حقیقت عظمیٰ کے نمائندے ہوں اور خُدا نے ملتِ بیضی سے آپ کو منتخب کیا ہے کہ آپ انسانوں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر شریعتِ اسلامی کی حفاظت و نگرانی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قوم میں سے آپ پر ایسے امور کی ذمہ داریاں عائد کی ہیں کہ جن سے قوم دنیا میں بامراد اور عقبیٰ میں بانصیب ہو سکے۔ اللہ جل جلالہٗ نے آپ کے لئے قیام عدل کے واسطے لوگوں کے قلوب اور دماغوں پر حکومت کا تخت بچھایا ہے۔ تاکہ ہدایت کی روشنی قائم رہ سکے اور آپ پر واجب کیا کہ اسلاف صالحین کی طرح آپ قوم کو برائیوں سے محفوظ رکھیں۔ اور امت کے ہر چھوٹے بڑے، دور و نزدیک حاضر و غائب سب نے آپ کی اس ریاست ثابتہ ربانیہ کا اپنے دلوں اور دماغوں میں اس طور پر اقرار کیا ہے کہ ہر حادثے میں قلوب آپ کی طرف کھنچتے ہیں اور ہر مصیبت میں آنکھیں آپ کی طرف اٹھتی ہیں، لوگ یقین رکھتے ہیں کہ ان کی بھلائی، ان کی سعادت اور ان کی نجات آپ کی ذات سے وابستہ ہے! اور ان کا امن اور ان کی امیدیں صرف آپ سے پوری ہو سکتی ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ملتِ ایران کو ان مسلسل حوادث نے اسے اپنے دین کے

راستے سے ہٹا دیا ہے اور مسلمانوں کے حقوق پر اغیار کی دست اندازیوں نے
ان کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ کسی بھلائی کے حصول کی کوشش کر سکیں۔
حالانکہ وہ حامل امانت ہیں اور قیامت کے دن ان سے اس کا سوال ہوگا اور
ان کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ ان کے نفوس نے اس روشنی سے استفادہ بند کر دیا
ہے اور عقول نے جولانی دکھانی ختم کر دی ہے۔ ان کے افکار مضمحل ہو گئے ہیں۔
اور ضعف کی حالت میں کھڑے ہوئے ہیں۔ افکار و اذعان، جہود و ایقان کی
درمیانی متحیرانہ حالت ان پر کچھ اس طرح حاوی ہے کہ انھیں راستوں کا پتہ نہیں
چلتا اور وہ وسواس کی آندھی میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ صحیح راستے سے کچھ
اس طرح بھٹکے ہوئے ہیں کہ انھیں کوئی راستہ بتانے والا بھی نہیں ملتا۔
ان کے قلوب پر یاس و ناامیدی اس طرح چھا گئی ہے اور امید کے دروازے انھیں
کچھ اس طرح بند نظر آتے ہیں کہ شاید وہ عنقریب ہدایت سے مایوس ہو کر گمراہی کو
قبول کر لیں حقانیت سے منہ موڑ کر خواہشات کے تابع ہو جائیں۔ افراد ملت ہر وقت
ایسے ایسے مباحث میں مصروف ہیں جو وقت کا نتیجہ ہے اور وہ ان اسباب پر غور کر رہے
ہیں جو اسلام کی کمزوری اور اس کے سکوت اور اعلاء کلمۃ اللہ و اقامت دین سے
منہ موڑنے کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے شریعت اور اہل شریعت دونوں
زندیقوں کے ہاتھ میں جا پڑتے ہیں۔ جو جیسا چاہتے ہیں حکم لگاتے ہیں اور جو
چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ضعیفوں کی ایک جماعت نے یہ سمجھ لیا ہے کہ
دلائل اسلام پادر ہوا ہیں اور اس کے براہین من گھڑت اور بے سر و پا باتیں ہیں
اور یہ صرف اس وجہ سے کہ وہ جماعت یہی دیکھتی ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ باوجودیکہ
آپ کو اجتماعی طاقت اور حجت ساطعہ حاصل ہے اور بلاشبہ آپ کا حکم نافذ ہے اور
ساری قوم میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کے حکم سے سرتابی کر سکے۔ بلاشبہ

اگر آپ اس کا ارادہ کریں تو ساری قوم آپ کی قوم آپ کی ایک آواز پر جمع ہو سکتی ہے۔ یہ وہ آواز ہوگی جو صداقت اور راست بازی کے منہ سے نکل کر لوگوں کے سینوں میں اتر جائے گی لیکن ان سب کے باوجود آپ اللہ اور قوم کے دشمنوں سے ڈرتے ہیں۔ کاش آپ ان کو زندیقوں کے شر سے محفوظ رکھتے اور ان میں جو خامیاں اور برائیاں پیدا ہو رہی ہیں! ان سے محفوظ رکھنے ان کو زندگی کی اس کشمکش سے نکال کر زیادہ صاف اور زیادہ پر لطف حیات تک پہنچاتے۔ اس طرح دین اور اہلِ دین عزت اور چین کی زندگی بسر کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ اہل حق کے سرگروہ ہیں اور بلاشبہ قوم کے ایک ایک فرد میں آپ ہی کی روح جاری وساری ہے۔ ان کی کوئی تحریک آپ کے بغیر چل نہیں سکتی اور اس کا کوئی اجتماع آپ کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر آپ کھڑے ہوں گے تو سب کھڑے ہو جائیں گے اور ان کی آواز بلند آواز ہوگی۔ اگر آپ چپ سادھے بیٹھے رہے تو سب چپکے بیٹھے رہیں گے اور ان کی آواز بے وزن آواز ہوگی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر قائد نے چشم پوشی کی اور ان کو بغیر سرگروہ اور رہنما کے چھوڑ دیا اور ان کی رہبری نہ کی تو ان کے لئے اپنی بے عملیوں اور تساہل وتسامح کے لئے ایک عذر پیدا ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حجت الاسلام نے کسی ایسے عمل میں بودے پن سے کام لیا جو امت کے خاص وعام ہر ہر فرد کے لئے ضروری تھا تو وہ لغو اور وہم زائیدہ خطرات سے ڈرنے لگتے ہیں بے شبہ یہ سوال دین کی حفاظت، روحِ اسلام کی برقراری اور اس کی شہرت اور وقار کے قائم رکھنے اور شرفِ دائمہ اور سعادتِ تامہ کے وجود کا ہے۔ کون شخص ہے جو اس کے لئے اس شخص سے زیادہ موزوں ہوگا جسے اللہ تعالیٰ نے چودھویں صدی میں اپنے کام کے لئے پسند فرما لیا ہے اور جسے پروردگار نے

اپنے دین کے لئے برہان اور مخلوق کے لئے حجت بنا کر بھیجا ہے۔

مولینا مکرم و قائد اعظم! بادشاہ کا دل اور دماغ دونوں ماؤف ہو چکے ہیں۔ اس کی سیرت بری ہو چکی ہے۔ اس کے حرکات ضعیف اور اس کے علامات قبیح ہو چکے ہیں۔ وہ ملکی سیاست اور اللہ کی مخلوق کے مفاد سے عاجز آچکا ہے۔ اس نے تمام امور کی باگ ایک گنہگار اور بد دین کے سپرد کر دی ہے جو بر خود غلط، مغرور اور ظالم ہے۔ وہ انبیا کو برملا علی رؤس الاشہاد گالیاں دیتا ہے اور اللہ کی شریعت میں کسی بات پر ایمان نہیں رکھتا۔ بزرگان دین کی کوئی عزت و توقیر اس کے دماغ میں نہیں علماء کو برا بھلا کہتا ہے۔ متقی لوگوں پر تہمتیں باندھتا ہے، اور سادات کی توہین کرتا ہے۔ واعظوں کے ساتھ اس کا معاملہ کمینوں کا سا ہے۔ جب سے بلاد فرنگ سے واپس آیا ہے حیا کے جامے کو اس نے گویا بالکل اتار پھینکا ہے، شرابیں پیتا ہے کفار سے دوستی کرتا ہے اور دینداروں سے دشمنی رکھتا ہے۔ یہ اس کے ذاتی افعال تھے۔ مزید برآں اس نے سلطنت ایران کے ایک بڑے حصے اور منافع کو دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اس کے راستے، اس کی شاہ راہیں، سڑکیں، مسافر خانے، باغ، کھیتیاں، نہریں، کاروان، اس کے کنارے کے زرخیز علاقے، آبپاشی کے ذرائع، اہواز سے طہران تک کا راستہ، اس کی عمارتیں، تمباکو، اس کے مزارع، اس کی بارکیں، اس کے گودام، اس کی ایجنسیاں، سب اس نے دشمنوں کے ہاتھ میں دے دی ہیں، انگوروں کے گودام، شرابوں کے لئے ہیں، اس کی دکانیں اور اس کے عملے اور اس کے کارخانے سب اسی کی ملک ہیں۔ صابون، موم، شکر اور اس کے کاروبار اور بنک پر اغیار کا قبضہ ہے۔ افسوس آپ نہیں جانتے بنک کیا ہے۔ بنک دشمنوں کے

ہاتھ میں حکومت کی لگام دے دینا ہے۔ قوم کو اس کا غلام اور اس کی ملک بنا لینا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی سلطنت اور اس کی ریاست کو قبول کر لینا ہے۔

پھر اس غبی خائن نے سوچا کہ عام لوگوں کو ان جھوٹی دلیلوں اور فضول حجتوں سے راضی کر لے تو یہ کو اس شروع کی کہ یہ تمام معاملات چند روزہ اور یہ تمام قبضے وقتی ہیں۔ یہ نو برس سے زیادہ کے لئے نہیں۔ اللہ ہی سمجھے ان خیانت کرنے والوں اور ان کے دلائل سے۔ اور دولتِ روسیہ کے سامنے (اگر وہ ساکت ہے تو) اس کے صلے میں بقیہ جزو پیش کیا ہے۔ مرداب رشت، طبرستان کی نہریں، خراسان کی سڑک، اور اس کے متعلقہ مکانات، کھیتیاں اور سرائیں ہیں۔ لیکن دولتِ روسیہ اس سے ناک بھوں چڑھا رہی ہے اور اس تحفے کے قبول کرنے سے اعراض کر رہی ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ خراسان پر قبضہ کر لے، آذربائیجان اور مازندران پر تصرف حاصل کر لے۔ اگر یہ معاملات اور یہ معاہدات جو ساری مملکت ایران کو سپرد کر دینے پر مبنی ہیں منسوخ نہ ہوئے تو اس نکمّے غلام کی سیاست کا یہ اولین نتیجہ ہوگا۔

غرض یہ کہ مجرم بیع کے لئے سلطنتوں کے سامنے سارے بلاد ایران کو پیش کر رہا ہے اور وہ ممالک اسلام اور رسول اللہ صلعم کی محبت کو بیچ رہا ہے اجنبیوں کے ہاتھ۔ لیکن اپنی دنائت طبع اور اپنی منحوس فطرت کی بنا پر چند ٹکوں اور بہت ہی تھوڑے سے داموں میں بیچتا ہے، ہاں یہی ہوتا ہے۔ جب بدنیتی اور خیانت، حماقت کے ساتھ آمیز ہو جاتی ہے۔

اے حجۃ الاسلام اگر آپ قوم کی امداد کے لئے کھڑے نہ ہوئے اور ان کو کسی ایک فیصلے پر مجتمع نہیں کیا اور آپ نے اگر قوم کو اس ناپاک کے

ہاتھ سے شرعی قوت کے ذریعے نہیں نکالا، تو اقطاع اسلامی اجنبیوں کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ وہ جیسا چاہیں گے حکم دیں گے اور جسے چاہیں گے نکال پھینکیں گے۔

مولینا! اگر آپ نے اس وقت سے فائدہ نہ اٹھایا اور یہ کام آپ کی زندگی میں ہو چکا تو آپ صفحۂ عالم اور تواریخ عالم میں اپنا کوئی اچھا تذکرہ اپنے بعد نہ چھوڑیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ علماء ایران سب کے سب اور عوام سارے آپ کے ایک لفظ کے منتظر ہیں کہ جس کے ذریعے اپنی سعادت اور اپنی نجات دیکھ رہے ہیں۔ اور جسے اللہ جل جلالہ نے ایسی قوتیں عطا فرمائی ہوں۔ کیسے اس کے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے۔ اس کی قوم پر زیادتی کی جائے اور وہ اسے چھوڑ دے۔

مولینا! میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں جسے خبیر ہی کہہ سکتا ہے اور بصیر ہی سمجھ سکتا ہے۔ دولتِ عثمانیہ آپ کی اس مستعدی سے خوش ہوگی اور آپ کی امداد کرے گی۔ کیونکہ دولتِ عثمانیہ خوب سمجھتی ہے کہ اقطار ایران میں فرنگ کا داخلہ اور ان کا استیلا لامحالہ سلطنت عثمانیہ کے لئے مضرت کا باعث ہوگا۔ وزراء اور امراء ایران سب آپ سے خوش ہوں گے۔ کیونکہ وہ سب کے سب ان جدید باتوں سے طبعاً برافروختہ اور ناخوش ہیں۔ آپ کی اس تحریک سے ان محدثات کے ابطال کا ایک موقع اور اس شر کے، جس پر وہ جبراً راضی ہو گئے ہیں۔ مٹانے کی ایک فرصت ہاتھ آجائے گی۔ علماء اگرچہ اور بھی بہت سے ہیں اور انھوں نے اس خائن کے برے اعمال پر ٹوکا بھی ہے لیکن ان کی انفرادی آواز کی وجہ سے اس نے ان کو ڈانٹ دیا۔ اور ان کو مجرموں کی طرح جھڑک کر نکال دیا۔ اس لئے کہ کسی نے ان کو ایک مقصد کے تحت متحد نہیں کیا۔

یہ علما اپنے علمی مدارج میں برابری اور اپنے رتبوں میں مساوات اور مشابہت کی وجہ سے ایک دوسرے کو نہیں کھینچ سکتے۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ان میں ایک مرکز ہو سکے۔ اس لئے ان کے درمیان تاثیر جذب وانجذاب اس وقت تک متحقق نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ کوئی ہیئت واحدہ اور قوت جامعہ جس سے دفع شر اور حفاظت ملک ممکن ہو، ان کو متفق نہ کر دے، ہر چیز اپنے محور پر گھومتی ہے۔ اور ہر چیز اپنے مرکز سے متعلق ہوتی ہے (یہ ہے حقیقی سبب ضعف مقاومت اور منکروں کی قوت کا)۔

مولینا! آپ اکیلے ان اوصاف کی بناء پر جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہے یعنی درجہ سامیہ، منزلت عالیہ، صلاحیت کار، لوگوں کو جمع کرنے کی قوت اور بکھری ہوئی طاقتوں کو اکھٹا کرنے کی صلاحیت ان کی رو سے آپ یقیناً ان مختلف طاقتوں کو ایک جگہ لا سکیں گے۔ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ حقیقی یکسانیت پیدا کر سکتا ہے جو ایران پر آئی ہوئی مصیبتوں کو دفع کر سکتا ہے۔ اور دین کے وقار اور عزت کو محفوظ رکھ سکے۔ اس طرح ہر چیز آپ سے اور آپ کی ذات سے وابستہ ہے۔ آپ ہی کو مرکزیت حاصل ہے۔ آپ ان تمام امور کے جواب دہ ہیں اللہ کے نزدیک بھی اور بندوں کے سامنے بھی۔

علماء اور صلحا اپنے انفرادی دفاع میں بہت سی ایسی مصیبتیں اور شدائد برداشت کر چکے ہیں جو درد انگیز ہیں۔ اور پچھلی چند صدیوں سے بلاد مسلمین کی حفاظت اور ان کے حقوق کی صیانت کے لئے ہر قسم کی ذلتیں اور رسوائیاں اور فضیحتیں اٹھا چکے ہیں۔

بے شبہ مولینا نے سنا ہو گا کہ کفار اور مشرکوں کے ان معاونوں نے

عالم وفاضل، صالح وواعظ، حاجی ملاّ فضل اللہ دربندی کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اور عنقریب سنیں گے کہ ان ظالموں اور جفا کاروں نے مجتہد اعظم عالم متقی حاجی علی اکبر شیرازی اور دوسرے حامیان قوم و ملک کے ساتھ قتل و ضرب، شکنجے اور حبس کا کیسا برتاؤ کیا۔ اس زمرے میں وہ جوان صالح مرزا محمّد رضا کرمانی بھی تھا جسے اس مرتد نے مجلس میں قتل کر دیا۔ اور اسی گروہ میں وہ فاضل، کامل، حاجی، سیاح، عالم، ادیب، مرزا فروغی، مرزا محمّد علی خاں اور فاضل اعتماد السلطنت وغیرہ شامل ہیں۔

رہا میرا قصہ اور جو کچھ میرے ساتھ برتاؤ کیا اس جابر و ظالم نے تو یہ ان واقعات میں سے ہے جس سے اہل ایمان کے جگر کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور یقین ایمانی رکھنے والوں کے قلب پھٹ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اہل کفر اور بتوں کے پوجنے والے بھی اس سے تھرا اٹھتے ہیں۔ وہ یہ تھا کہ اس لعنتی نے حکم دیا کہ مجھے برف پہ قید کر دیا جائے جب کہ میں حضرت عبدالعظیم میں اپنے شدتِ مرض کی وجہ سے قلعہ بند تھا۔ اسی برف میں میں دارالحکومت تک لایا گیا۔ اس قدر رسوائیوں، ذلتوں اور اہانتوں کے ساتھ کہ اس سے زیادہ اور کوئی برائی تصوّر نہیں کی جا سکتی (اور یہ چیز لوٹ و غارت گری کے بعد تھی إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔)

پھر مجھے ان بدمعاشوں نے اسی حالتِ مرض میں پابجولاں چکڑے پر ڈال دیا۔ حالانکہ زمانہ سخت سردیوں کا تھا۔ برف برابر پڑ رہی تھی اور کرۂ زمہریر سے چلنے والی نہایت سرد ہوا مسلسل چل رہی تھی۔ مجھے سواروں کے ایک دستے نے گھسیٹ کر خانقین تک پہنچایا۔ پولیس کی ایک جماعت ہمارے ساتھ تھی۔ اور والی نے مجھ سے پہلے ہی یہ چاہا تھا کہ میں بصرہ چلا جاؤں

کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے مجھے اپنی حالت پر چھوڑ دیا تو اے فاضل محترم، میں آپ سے ضرور ملتا اور میں آپ سے اس کی اور قوم کی حالت بیان کرتا۔ اور آپ سے ان تمام مصیبتوں کا ذکر کرتا جو تمام بلاد اسلامیہ پر اس فاسق اور بدمعاش کی وجہ مسلط ہو گئی ہیں۔ میں آپ کو دین کی امداد کی دعوت دیتا اور یقیناً آپ کو مسلمانوں کی فریاد سننے پر آمادہ و تیار کر لیتا۔ یہ یقینی امر تھا کہ اگر میں آپ سے مل جاتا تو اس کی مخرب بلاد اور مہلک عباد لعنتی وزارتی سلسلہ باقی نہ رہتا۔ مزید بر آں اس نے پوری دنائت اور خیانت سے عوام کے ہیجان اور ان کی پریشانی کو روکنے کے لئے ان تمام شرارتوں کو فرقۂ بابیہ کی طرف منسوب کر دیا چنانچہ اس نے (اللہ اس کی زبان کاٹے) لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ میں مجنون ہوں، آہ، افسوس، اسلام پر یہ کمزوری یہ ضعف، یہ نکبت کیسے چھا گئی کہ ایک بے نسب فقیر اور خسیس الحسب بھکاری اس قابل ہو گیا کہ مسلمانوں کو، مسلمانوں کے بلاد کو، مسلمانوں کے گھروں کو چند ٹکوں میں بیچ دے، علمار کی ہتک کرے، خاندان مرتضوی کی توہین کرے، سادات علویہ پر بہتان عظیم باندھے۔ کیا کوئی ایسا ہاتھ نہیں جو اس پر قدرت رکھتا ہو کہ مسلمانوں کے دلوں کے تسکین دینے اور آلِ سید المرسلین علیہ وعلی آلہ والصلوٰۃ والسلام کی طرف سے انتقام لینے کے لئے اس خبیث کا استیصال کرے۔

چونکہ میں نے اپنے آپ کو حضرت عالی سے بہت دور پایا اس لئے اب تک شکوہ و شکایت سے باز رہا۔ لیکن عالم مجتہد حاجی سید علی اکبر جب بصرہ تشریف لائے تو انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں قائد اعظم کے پاس یہ تمام قصے اور یہ تمام حوادثات و واقعات

لکھ بھیجوں۔ چنانچہ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور میں جانتا ہوں کہ اللہ جل جلالہ عنقریب آپ کے ہاتھوں سے کام لے گا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

جمال الدین الحسینی
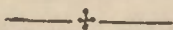
سیّد کا آخری خط ایک ایرانی دوست کے نام

[تاریخ بیداری ایرانیان مصنفہ ناظم الاسلام کرمانی

(جلد اول) سے ہم شیخ کے ایک اور فارسی خط کا ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ جو شیخ نے قسطنطنیہ میں اپنی نظربندی کے زمانے میں اپنے ایک ایرانی دوست کو لکھا تھا۔ غالباً یہ ان کا آخری خط تھا۔ "یہ خط ان کے نفس کی کیفیات اور ان کے بلند ارادوں اور ان کے اسلامی جذبات و افکار کا ایک مجلّا آئینہ ہے۔ اس خط کے الفاظ ایک آخری وصیت کا درجہ رکھتے ہیں۔"]

میں اس وقت یہ خط اپنے ایک عزیز دوست کو لکھ رہا ہوں۔ اس حال میں لکھ رہا ہوں کہ حبس میں مقید ہوں۔ اور اپنے دوستوں کی ملاقات سے محروم۔ نہ مجھے نجات کا انتظار ہے نہ زندگی کی امید۔ نہ گرفتاری سے ملول ہوں اور مارے جانے سے متوحش، خوش ہوں اپنی گرفتاری سے، خوش ہوں اپنے مارے جانے سے۔ میرا جسم مقید ہے آزادیٔ نوع کے لئے، میں مارا جاتا ہوں قوم کی زندگی کے لئے۔

لیکن افسوس ہے تو اس کا کہ اپنی بوئی ہوئی کھیتی کو سرسبز

دیکھنے کی جو آرزو رکھتا تھا۔ وہ پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ شمشیر شقاوت نے موقع نہ دیا کہ مشرق کی قوموں کی بیداری کا نظارہ کرتا۔ دستِ جہالت نے فرصت نہ دی کہ امم مشرق کے حلق سے نکلنے والی صدائے آزادی سنتا!

اے کاش، میں نے اپنے افکار کے سارے تخم ملّت کے زرخیز مزرعہ میں بوئے ہوتے کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں نے اپنے بار آور تخم سلطنت کے شورہ زار میں نہ ڈالے ہوتے، جو کچھ مزرعہ میں نے بویا اس میں نمو ہوتا دیکھا۔ جو کچھ اس بنجر زمین میں ڈالا بے کار گیا، اس مدت میں میری ساری خیر خواہانہ زحمتیں سلاطین مشرق کے کانوں تک نہ پہنچیں، سب کو شہوت اور جہالت نے ان کو قبول کرنے نہ دیا۔ میری امیدیں اپنے ایران سے وابستہ تھیں، لیکن اس نے میری زحمتوں کا اجر یہ دیا کہ مجھ پر غضب نازل کیا، اور ہزاروں وعدوں کے ساتھ تر کی پہنچا دیا۔ اور اب مجھ پر یہ قہر و غضب نازل کرتے ہیں۔ اس سے غافل ہیں کہ صاحب نیت کا عدم نیت کو معدوم نہیں کر سکتا، صفحۂ روزگار حرفِ حق کو ضبط کر لیتا ہے۔

اب میں اپنے عزیز دوست سے خواہش کرتا ہوں کہ وہ میرے اس آخری خط کو میرے عزیز دوستوں اور ہم مسلک ایرانیوں تک پہنچا دیں اور زبانی ان سے کہیں کہ تم ایران کے "میوۂ رسیدہ" ہو۔ تم نے ایران کی بیداری کے لئے اپنی کمرِ ہمّت کس لی ہے۔ قید و بند اور غارت گری سے نہ ڈرنا، ایرانی جہالت سے خستہ نہ ہونا، سلاطین کے حرکات مذبوحی سے نہ گھبرانا، نہایت سرعت کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش اور نہایت مستعدی کے ساتھ کوشش کئے جاؤ فطرت تمہارے ساتھ ہے۔ اور خالق فطرت تمہارا مددگار۔ تجدّد کا

سیل تیزی کے ساتھ مشرق کی طرف رواں ہے۔ مطلق العنان حکومت کا
خاتمہ ہونے والا ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ مطلق العنان حکومت کی بنیادی
خرابیوں کی اصلاح کرو نہ کہ اشخاص کا قلع قمع۔ جہاں تک تمہیں قدرت ہو
ایسی عادتوں کے چھڑانے کی کوشش کرنا۔ جو ایرانی سعادت کے
حصول میں مشکل دیواریں بن کر حائل ہیں۔ نہ کہ ایسی عادت والے لوگوں
ہی کو مٹانے کی کوشش کرو کہ ایسے موانعات جو تمہاری اور دوسری
قوموں کے درمیان الفت و محبت کی راہ بند کرتی ہیں۔ سب دور ہو جائیں
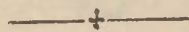
تصانیف افغانی

عربی

اتیمۃ البیان فی تاریخ افغان

یہ افغانستان کی تاریخ، پہلے فارسی زبان میں مرتب ہوئی۔ پھر مصر میں اس کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ اس کی تالیف میں اور ماخذوں کے علاوہ فرانسیسی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں مصر سے شائع ہوئی اس کا اردو ترجمہ ابوالمحاسن محمود علی نے کیا ہے اور سنہ ۱۳۴۲ھ میں صوفی پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئی ہے

۲۔ العروۃ الوثقیٰ

یہ رسالہ پیرس سے علامہ افغانی اور ان کے شاگرد مفتی شیخ محمد عبدہٗ کی ادارت میں نکلا تھا۔ اس کے کل اٹھارہ نمبر نکلے۔ مضامین کے آخر میں مضمون نگار کا نام درج نہیں، اس لئے قطعی طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ کون سے مضامین شیخ کے ہیں اور کون سے سید کے۔ اردو میں ان مضامین کے بعض انتخابات "مضامین جمال الدین افغانی" (محمد عبدالقدوس قاسمی، ادارہ فروغ اردو، لاہور) اور "مقالات جمالیہ" کے نام سے شائع ہوئے ہیں، لیکن تمام مضامین کا مستند ترجمہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔

مصر سے یہ مضامین کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

۳۔ رسالہ ضیاء الخافقین

لندن کے قیام کے زمانے میں سید نے عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ملا جلا ایک رسالہ نکالا تھا، اس کے مضامین کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہیں۔

۴۔ مباحثات از ارنسٹ رینان در توافق تمدن اسلام

یہ سید کے ان مباحث کا مجموعہ ہے جو فرانسیسی مستشرق رینان سے سید نے اسلام اور تمدن کے بارے میں کئے تھے۔ اسلام اور علم کے نام سے سید کے یہ مضامین کالمان لیوی نے رینان کی تصانیف کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ نیز رینان کا لکچر اور شیخ کے جوابات حسن آفندی عاصم نے عربی زبان میں ترجمہ کر کے مصر سے شائع کئے ہیں اردو میں اس کا ترجمہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے "علم اور اسلام" کے نام سے کیا ہے۔ معارف پریس، اعظم گڈھ ۱۹۳۵ء۔

۵۔ الرد علی الدہریین

یہ سید کے فارسی رسالہ "ردِ نیچریاں" کا عربی ترجمہ ہے۔ خود علامہ افغانی نے قیام مصر کے زمانے میں اسے فارسی سے عربی پر منتقل کیا تھا۔ شیخ محمد عبدہ کے ایک مفصل مقدمہ کے ساتھ مصر سے شائع ہوا ہے۔

۶۔ بابی مذہب پر مضامین

بطرس بستانی کے دائرۃ المعارف میں بابی مذہب پر شیخ کے مضامین، دائرۃ المعارف، مطبوعہ بیروت ۱۸۸۱ء۔

۷۔ القضا و القدر

ایک مختصر عربی رسالہ۔ مقدمہ اور سوانح حیات کے ساتھ مصر سے شائع ہوا

فارسی

۸۔ مقالاتِ جمالیہ

یہ جمال الدین افغانی کے فارسی مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین بیشتر قیام ہندوستان کے زمانے کی یادگار ہیں، اور ہندوستان کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں عبدالغفور شہباز نے علامہ افغانی کی اجازت سے ان کا ایک مجموعہ ربن پریس کلکتہ سے شائع کیا تھا۔ پھر لطف اللہ نے جو اپنے آپ کو سید کا خواہر زادہ بتاتے ہیں ایک اور مجموعہ اسی نام سے طہران سے شائع کیا۔ بعض مضامین شہباز کے مجموعہ میں نہیں ہیں اور لطف اللہ کے مجموعہ میں موجود ہیں، بعض شہباز کے مجموعہ میں موجود ہیں اور لطف اللہ کے مجموعہ میں نہیں ہیں۔

علامہ افغانی کے تمام فارسی مقالات کا ترجمہ "مقالات جمال الدین افغانی" کے نام سے "دار الاشاعت سیاسیہ" حیدر آباد نے شائع کیا ہے۔

۹۔ رسالہ ردِ نیچریاں

حیدر آباد کے زمانۂ قیام (۱۲۹۸ھ) میں محمد واصل صاحب مدرس مدرسہ معزہ نے نیچریوں کے مذہب کے بارے میں علامہ افغانی سے سوال کیا تھا۔ یہ رسالہ اس کے جواب میں فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ محمد حسن بمبئی کے مطبع سے پہلی مرتبہ ۱۲۹۸ھ میں شائع ہوا! ایک سے زیادہ مرتبہ اس کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۱۰۔ فلسفۂ شہادت حضرت سیّد الشہداءؑ

لطف اللہ کے بیان کے مطابق سید نے فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ اس موضوع پر لکھا تھا۔ اور اب یہ ناپید ہے۔

۱۱۔مختلف عربی، فرانسیسی اور فارسی مکتوبات

ان مکتوبات میں سب سے زیادہ اہم خط وہ ہے جو تمباکو کے اجارے کے سلسلے میں مجتہد اعظم ایران کو لکھا گیا تھا۔ فارسی، عربی انگریزی میں اس خط کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ناصر الدین شاہ قاچار اور مسٹر بلنٹ کے تمام موسومہ خطوط بھی اپنی جگہ کافی اہمیت رکھتے ہیں بعض خطوط لطف اللہ جانی اور دوسرے لوگوں کے نام ہیں۔

۱۲۔انگریزی مضامین

سید کے بعض انگریزی مضامین مشہور انگریزی سہ ماہی رسالے EDENBURGH REVIEW میں شائع ہوئے تھے، یہ سلسلہ ۱۸۶۰ء سے لے کر ۱۸۶۴ء تک جاری رہا۔

—— + ——

کتابیات

علامہ جمال الدین افغانی کی سوانح حیات اور کارناموں کے مطالعہ کے لئے اہم ترین کتابیات۔

اُردُو

۱۔ آثار جمال الدین افغانی از قاضی عبدالغفار۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند)
۲۔ جمال الدین افغانی۔ قاضی عبدالغفار۔ اردو اکاڈمی کے آگے ایک تقریہ جامعہ ملیہ دہلی۔
۳۔ جمال الدین افغانی۔ جامعہ ملیہ کے استاد کے قلم سے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

فارسی

۱۔ شرح حال و آثار جمال الدین اسدآبادی معروف بہ افغانی۔ از مرزا لطف اللہ خاں اسدآبادی۔ برلین ۱۹۲۶ء۔
۲۔ گفتار خوش یارقلی۔ از شیخ محمد محلاتی غروی۔ ج ۱۔ طبع نجف، و طبع ثانی طہران ۱۳۰۵ھ۔
۳۔ مردان نامی شرق۔ از فرخ زاد۔ طبع بیروت۔
۴۔ تاریخ بیداری ایرانیان۔ از ناظم الاسلام کرمانی۔ دو جلد۔ طبع ایران۔
۵۔ دبستان الفرصۃ۔ از فرصت شیرازی۔ طبع ایران۔
۶۔ شمسیہ لندنیہ فناسوتیہ۔ از باقر خاں بوانانی ملقب بابراہیم جان معطر۔ دو جلد۔ طبع ایران۔

۷۔ المآثر والآثار۔ از میرزا محمد حسن خاں اعتماد السلطنت۔ طبع ایران۔

۸۔ فلسفۂ نیکو۔ طبع ایران۔

۹۔ جمال الدین افغانی۔ رسالۂ کاوہ۔ برلین۔

۱۰۔ کشف تلبیس۔ رسالہ کاوہ۔ برلین۔

۱۱۔ جاوید نامہ۔ علامہ اقبال، لاہور۔

۱۲۔ مختصر تاریخ ایران۔ از مرزا محمد علی بن ذکاء الملک، مظفری پریس بمبئی۔

عربی

۱۔ مشاہیر الشرق۔ جرجی زیدان۔

۲۔ اشہر مشاہیر الشرق۔ شکیب ارسلان۔ طبع مصر۔

۳۔ اشہر مشاہیر ادباء الشرق۔ محمد حسن عبدالفتاح طبع مصر۔

۴۔ الصحافۃ العربیہ۔ فلب دی ترازی ۲۔ طبع بیروت

۵۔ مقدمہ "الرد علی الدہریین" شیخ محمد عبدہ، سنہ ۱۹۲۵ء۔ طبع مصر۔

۶۔ فلسفہ الدین واللغہ۔ طبع مصر۔

۷۔ تالیفات سید محمد رشید رضا المنار۔ طبع قاہرہ مصر۔

۸۔ مقدمہ العروۃ الوثقٰی مصطفی عبدالرازق۔ طبع مصر سنہ ۱۹۲۸ء۔

۹۔ حاضر العالم الاسلام شکیب ارسلان

۱۰۔ آثار جمال الدین افغانی۔ اصمعی۔ طبع مصر۔ سنہ ۱۹۰۱ء۔

۱۱۔ آثار جمال الدین الافغانی۔ مقالہ للعلامہ عبدالقدوس الہاشمی فی کتاب معجم المصنفین لہ ولاستاذہ العلامہ محمود الحسن التونکی۔

جملہ قیمتیں سکۂ کلدار درج ہیں

نفیس ترین لٹریچر

فکرِ اقبال

اقبالؒ ہی وہ فیلسوف و حکیم ہے جس نے حکمتِ جدید کے فریب دہ نظریات پر تنقید کی ہے۔ اور کھوٹے کھرے کو پرکھا ہے۔ اور اپنے ضمیر کی روشنی سے فکرِ جدید کے اندھیروں کو دور کر دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے ان ہی افکارِ بلند پر مشاہیر اہلِ قلم کے گراں قدر مقالات کا یہ مجموعہ ہے۔

قیمت چار روپے۔ مجلد رنگین گرد پوش

حکمتِ اقبال

حکمتِ اقبال ایسی حکمت نہیں جو حق اور سوزِ دل سے خالی ہو۔ بلکہ یہ وہ حکمت ہے جو سوزِ دل سے مل کر پیکرِ شعر اختیار کرتی ہے۔ اقبال کی تمام تر شاعری اسی حکمت سے لبریز ہے۔ یہ کتاب علامہ اقبال کے فلسفیانہ و حکیمانہ خیالات کی تشریح و توضیح ہے۔

قیمت چار روپے۔ مجلد رنگین گرد پوش۔

تصوراتِ اقبالؒ

از جناب شاغل فخری۔ انیسویں صدی لنے جاتے جاتے جو انسانیت نواز

قوتیں دنیا کو عطا کیں۔ ان میں خاکِ ہند کا ایک شرارہ اقبال بھی تھا۔ جو آگے چل کر ماہتاب آفتاب بن کر چمکا جس کی خودی نے وہ مقام پالیا جو ابدیت سے ہم کنار ہے۔

قیمت تین روپے چھ آنے۔ مجلد رنگین گرد پوش

فلسفۂ عجم

علامہ اقبال رح کے مشہور انگریزی مقالات کا اردو ترجمہ از میر حسن الدین بی۔ اے۔ ایل ایل بی

یہ وہ کتاب ہے جس نے علامہ مرحوم کی صلاحیت کا ڈنکا بجوا دیا۔ وہ انمول کتاب ہے جس نے مرحوم کو علامہ بنا دیا۔ قیمت تین روپے دو آنے مجلد معہ رنگین گرد پوش

داستان کربلا

از عبد الرحمٰن سعید صدیقی بی۔ اے۔ واقعۂ کربلا تاریخ اسلام کا وہ عدیم النظیر واقعہ ہے جس پر تیرہ سو سال سے ہر سال لاکھوں جاں سوز آنسو بہائے جاتے ہیں اور ہزاروں درد و کرب اور اضطراب و الم کی چیخیں اور پکاریں اٹھتی ہیں اور لا تعداد سینے سوزش اور تپش سے بیقرار رہتے ہیں۔ آپ بھی مطالعہ کیجئے کیوں درد و الم کی چیخوں اور تڑپ کی بے چینیوں سے ہنگامہ خونی بپا ہوتا ہے۔ قیمت دو روپے چودہ آنے مجلد معہ رنگین گرد پوش

نازیت

از جناب شاہد رزاقی ایم۔ اے۔ نازی ازم جس کے خونی دیوتا ہٹلر نے ۱۹۳۹ء سے لے کر مئی ۱۹۴۵ء تک لاکھوں بچوں کو یتیم لاکھوں عورتوں کو بیوہ اور لاکھوں ماؤں کو بے بس کر دیا۔ دنیا کی اس خوفناک ترین تحریک نازی ازم کے متعلق اردو ادب کا دامن خالی تھا اپنے موضوع پر یکتا اور پہلی کتاب ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔ مجلد گرد پوش

سیر افغانستان

از جناب علامہ سید سلیمان ندوی۔ بیسویں صدی کے تین ہندوستانی مشاہیر علامہ اقبال سر سید راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی کا سفر افغانستان۔ ان ہر سہ بزرگوں کے تاثرات

نادر شاہ سے ملاقات تاریخی حالات حکیم سنائی محمود غزنوی اور مشاہیر عالم سے روحانی ملاقات یہ سفر نامہ ہندوستان کے قابلِ فخر مؤرخ نے لکھا ہے جو نہ صرف مؤرخ ہے بلکہ بلند پایہ ادیب اور عدیم المثال عالم ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ مجلد معہ رنگین گرد پوش

قائدین کے خطوط جناح کے نام

ترجمہ سعید صدیقی۔ جواہر لعل نہرو، مہاتما گاندھی، سبھاش چندر بوس کے سیاسی خطوط معہ جوابات۔ جوان ہر سہ لیڈران نے قائدِ اعظم جناح کے نام لکھے۔ یہ خطوط ہندوستان کی اس جنگِ آزادی اور اس کی کشمکش کے آئینہ دار ہیں۔ قیمت دو روپے۔ مجلد معہ رنگین گرد پوش

اسلام کے سیاسی تصورات

اسلام صرف روح کی شانتی ہی نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ اسلام کی تعلیمات اور مسلمات کے علاوہ اس کے سیاسی تصورات کی تصریح دنیا کے مقتدر مفکرین نے فرمائی ہے۔ مقالہ نگاروں میں علامہ اقبال مرحوم، مولینا ابوالکلام آزاد، سعید حلیم پاشا، ڈاکٹر حمید اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔ مجلد رنگین گرد پوش

کرنل لارنس

جس نے عرب کے آتش فشاں میدانوں میں اپنی فتنہ پردازیوں کے جال بچھائے جس نے ترکوں کو ناک چنے چبوائے جس نے تختِ افغانستان کو الٹ دیا۔ اپنے ملک اور قوم کا سب سے بڑا محسن۔ مگر ممالک اسلامیہ کا سب سے بڑا دشمن۔ اس نے تمام زندگی خاک و خون میں لوٹ کر اور خطروں سے کھیل کر گزاری۔ اس جانباز کے پُر اسرار حالات اسی کے ایک دوست سے سنیئے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔ مجلد معہ رنگین گرد پوش

مظلوم دوشیزہ

(جون آف آرک) ایک کسان کی نوخیز لڑکی جس نے فرانس کو غلامی اور تباہی سے اُس وقت بچایا جب ملک کے بڑے بڑے جنگجو اور سیاست دان بدحواس تھے اس دوشیزہ نے

طوفان جنگ کا مقابلہ کیا۔ اہل فرانس کو غلامی کی لعنت سے بچایا۔ حاسدوں نے اسے زندہ جلوا دیا۔ یورپ کے مشہور تخیل نگار برنارڈ شا کے شاہکار کا دلکش اردو ترجمہ۔

قیمت دو روپے چودہ آنے مجلد معہ رنگین گرد پوش

ذکرِ جمیل

از ماہر القادری۔ اُس محسنِ انسانیت کا پیام جس نے عرب کی وحشت کو رحمت سے بدلا جس نے گداؤں کو شاہوں کے مقابل بٹھایا جس نے مظلوم نسوانیت کو ناموسِ آدم بنا دیا! اس کا ذکر اور ماہر القادری کا قلم جس کا ہر ہر مصرعہ کیف و وجد میں ڈوبا ہوا۔ اور مستی و بے خودی کا پیامبر ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے مجلد معہ رنگین گرد پوش

چالیس کروڑ بھکاری

از ابراہیم جلیس جلیس کی نگاہ زندگی کی گہرائیوں میں پہنچ کر اس کے قصّے بیان کرتی ہے! ور قصّے کا ہر لفظ اور ہر نقطے سے درد بھرے دل کی دھڑکن پکارتی ہے کہ غلام آباد ہند کا ہر متنفس بھکاری ہے جلیس کے اس دکھ بھرے افسانوں کو پڑھیئے ممکن ہے کہ ان میں کوئی ایسی سبیل نظر آئے کہ چالیس کروڑ بھکاریوں کا یہ گروہ سکھ چین کا سانس لے سکے۔

قیمت دو روپے بارہ آنے مجلد رنگین معہ گرد پوش

طوفان

از رئیس احمد جعفری (ناول) یہ سمندر کا طوفان نہیں جس میں سر بفلک موجیں اٹھتی ہیں۔ یہ دل کے سمندر کا طوفان ہے جو لرزہ خیز ہولناک اور زہرہ گداز ہے۔ یہ طوفان ایک ایسی عورت کی زندگی میں آیا جو پہاڑ کی طرح اٹل بُت کی طرح خاموش چٹان کی طرح مضبوط تھی۔ لیکن جب اس کے دل میں طوفانی موجیں اٹھیں۔ تو نہ وہ پہاڑ تھی نہ چٹان تھی۔ بلکہ صرف ایک تنکا۔

قیمت تین روپے چھ آنے مجلد رنگین معہ گرد پوش

سزا

از قیسی رامپوری۔ گناہ کی کرختگی ممتا سے ٹکرا لیتی ہے تو پاش پاش ہو جاتی ہے بھائیوں کی دشمنی کے کانٹے کند ہو مرجھا جاتے ہیں۔ جرم زخمی ہو کر تڑپتا ہے! اور غیض میں آکر زندگی کو خون میں نہلاتا ہوا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

قیمت دو روپے چار آنے مجلد معہ رنگین گرد پوش

ہچکیاں

موت کے وقت بھی آتی ہیں اور خوشی کے وقت۔ شاید آنسوؤں کا رشتہ ہچکیوں سے اتنا ہی ہے جتنا قہقہوں سے۔ یہ افسانے نہیں بلکہ انسانیت کی وہ ہچکیاں ہیں جو آنسوؤں کے تار سے باہم پرو کر مالا بنا دی گئی ہے۔ اس میں دہکتی ہوئی بھوک مسکراتی ہوئی موت اور اس پورے نظام تمدن پر نظر ڈالتا ہوا قہقہہ۔

قیمت تین روپے چار آنے۔ مجلد معہ رنگین گرد پوش۔

ضربیں

از قیسی رامپوری (افسانوں کا مجموعہ) تار پر ضرب پڑتی ہے۔ نغمے پیدا ہوتے ہیں! اور جب دل پر حوادث کی ضرب پڑتی ہے تو نالے، لیکن انسانی سماج پر جب قابحییوں کی ضرب پڑتی تو ساری دنیا کو لرزہ اٹھتی ہے! ایسی ہی ضربوں کے مجموعہ کا نام ہے ضربیں۔

قیمت مجلد تین روپے معہ رنگین گرد پوش

آج کل کے رومان

اس مجموعے میں اردو کی چودہ بلند پایہ اہل قلم خواتین کے افسانے ہیں۔ ہر افسانہ زندگی کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔

قیمت دو روپے بارہ آنے۔ مجلد معہ رنگین گرد پوش

کوہِ نورُ کی سرگزشت

دنیا کے سب سے قیمتی اور مشہور ہیرے کوہِ نورُ کی یہ کہانی ہے جس نے بہت سے عروج وزوال دیکھے ہیں۔ ایک وقت میں اس کے پہننے والے تخت پر بیٹھے دوسرے وقت سولی پر۔ غرض یہ ہیرا بہت خوں چکاں داستانیں اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ کوہِ نورُ کی اتنی مکمل تاریخ پہلی مرتبہ اردو میں پیش کی گئی ہے۔

قیمت ایک روپیہ چار آنے

خطا

قیسی رامپوری (ناول) سماج کی بغاوت میں بہت سے ادبا نے خامہ فرسائی کی ہے۔ قیسی نے بغاوت نہیں کی۔ بلکہ ان دکھوں اور دردوں کو جو عورت کے تہ در تہ پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ کاغذ پر بکھیر دیا۔ اس دلچسپ ناول میں محبت کی چنگاریاں بھی ہیں اور نفرت کے شعلے بھی۔

قیمت تین روپے مجلد معہ رنگین گرد پوش

سرنوشت

از مجنوں گورکھپوری۔ ایک طویل افسانہ ——— ایک دم توڑتے ہوئے انسان کی داستانِ حیات!

سرنوشت، شاعروں کے تیر ونشتر نہیں۔ بلکہ زندگی کی ان تلخیوں کی تصویر ہے جو سراپا کرب واضطراب ہیں۔

سرنوشت ایک ایسا ادب ہے جس میں جیتی جاگتی زندگی موجود ہے۔ ایک ایسا دلدوز افسانہ جس کی تخلیق میں آہوں اور دل پاروں سے کام لیا گیا ہے۔

قیمت دو روپے۔ مجلد

ضیغم

(ناول) مترجمہ سیدہ منظہر بی۔ اے عثمانیہ۔ ایک دوشیزہ کس طرح ملک کے ایک وحشی ڈاکو کو سب سے بڑا مجاہد وطن بنا دیتی ہے۔ مسز پرل بک کے ایک طویل افسانے کا ترجمہ۔ زندہ چین کی ایک زندہ کہانی۔ قیمت مجلد دورنگی گرد پوش ایک روپیہ آٹھ آنے۔

غُبار

قیسی کے تازہ ترین افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ جس کا ہر افسانہ دل کی کسک اور زندگی کے زخموں کا ترجمان ہے۔ قیمت مجلد معہ گرد پوش دو روپے چار آنے۔

دل کی آگ

محبت کبھی سماج سے ٹکراتی ہے کبھی فرائض سے متصادم ہوتی ہے۔ اور نظامِ حیات بدل کر رکھ دیتی ہے۔ دل کی آگ دل کے گوشوں سے اٹھتی ہے۔ اور سب کچھ پھونک کر رکھ دیتی ہے۔ ایسی ہی ایک آگ پر کیف اور دلچسپ ناول کی صورت میں حضرت ظفر واسلی دہلوی نے پیش کی ہے قیمت مجلد دورنگی گرد پوش ایک روپیہ بارہ آنے